جلد ۶۹ مارچ ۱۹۶۸ء عدد ۱

ماھنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

زر سالانہ : ۷ روپے
فی پرچہ : ۷۵ پیسے

ترجمان القرآن، لاہور

فہرست مضامین

جلد ۶۹	مارچ ۱۹۶۸ء	عدد ۱

چندہ سالانہ :	ماہنامہ ترجمان القرآن	قیمت فی پرچہ
سات روپے	۵-اے ، ذیلدار پارک ، اچھرہ-لاہور	۷۵ پیسے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن ، اچھرہ ، لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

قرآن مجید نے خود اپنے اس دنیا میں نزول کے متعدد مقاصد بیان کیے ہیں۔ مثلاً یہ صداقت اور حکمت سے لبریز ہے، اس میں نصیحت حاصل کرنے والوں کے لیے نصیحت اور عبرت حاصل کرنے والوں کے لیے عبرت کا پورا سامان موجود ہے۔ یہ رُشد و ہدایت کا سرچشمہ، خیر اور بھلائی کا مخزن اور شرافت اور نیکی کا مبداء و منبع ہے۔ اس کی تعلیمات ہر خطا سے پاک، ہر کجی سے عاری، ہر عیب سے منزّہ اور ہر سُقم سے مامون ہیں۔ اس کی تصریحات بڑی جامع اور حکیمانہ ہیں اور ہر قسم کی غلطی سے مبرّا ہیں۔ جو بندگانِ خدا اپنے آپ کو روحانی عوارض سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں، یہ کتاب انہیں ان سے بچاتی ہے اور جو ان میں مبتلا ہو کر صحت کے طالب ہوں انہیں شفا بخشتی ہے۔ یہ ایک عدل کی ترازو ہے جس میں ہر انسان اپنے افکار و اعمال کو تول کر ان کی صحیح قدر و قیمت سے آشنا ہو سکتا ہے۔ یہ ایک کسوٹی ہے جس کے ذریعہ کھرے کو کھوٹے سے بآسانی الگ کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک نور ہے جو انسان کے قلب و دماغ کو منوّر کرتا ہے اور جس کی مدد سے وہ اپنے آپ کو پہچانتا اور اپنے خالق و مالک کی معرفت حاصل کرتا ہے۔

قرآن مجید نے اس نوعیت کے بے شمار مقاصد بیان کیے ہیں لیکن اگر انہیں غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ سارے مقاصد ایک بنیادی مقصد کی فروعات ہیں۔ اس کتابِ الٰہی کا اصل مقصد ایک ہی ہے کہ وہ انسانوں کے اندر اپنے خالق اور مالک کا صحیح ادراک پیدا کرے، انہیں اس کائنات میں اپنے صحیح مرتبہ اور مقام سے آشنا کرے اور پھر اُسے یہ بتائے کہ وہ اپنے رب کے ساتھ کس طرح صحیح بنیادوں پر رشتۂ عبودیت اُستوار کر سکتا ہے۔ خالقِ کائنات اور انسان کوئی ایسی بے ربط اکائیاں نہیں جن کا آپس میں کوئی تعلق نہ ہو۔ ان

کے درمیان عبد و معبود کا ایک خاص رشتہ پایا جاتا ہے۔ اس رشتے کے مضمرات اور اس کے تقاضوں کی قرآنِ حکیم وضاحت کرتا ہے۔ انسانیت کے اندر آج تک جس قدر گمراہیاں پھیلی ہیں ان کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُن سب کے پیچھے صرف ایک ہی چیز کام کر رہی تھی کہ انسان اپنے مالک کے صحیح ادراک میں ناکام ہوا، یا پھر وہ عبودیت کی اُن ذمہ داریوں سے کما حقہٗ عہدہ برآنہ ہو سکا جو اپنے خالق و مالک کے مخلص بندے کی حیثیت سے اُس پر عائد ہوتی ہیں۔

آیئے، اب یہ دیکھیں کہ قرآن مجید نے اس سلسلے میں انسانیت پر کتنے عظیم اور اَن گنت احسانات کیے ہیں۔

انسان پر کتابِ الٰہی کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اُس نے انسان کی ہدایت اور اس کی فلاح و کامرانی کے لیے نہ صرف اُسے اپنے خالق اور مالک کا صحیح شعور اور احساس عطا کیا ہے بلکہ اس سلسلے میں وہ جتنے غلط اور گمراہ کن تصورات کا شکار ہو سکتا تھا، اُن سب کے تباہ کن نتائج سے بھی اُسے پوری طرح آگاہ کر دیا ہے۔

اس ضمن میں اُس نے انسان کے قلب و دماغ پر سب سے پہلے اس بنیادی حقیقت کا نقش ثبت کیا ہے کہ قدرت کا یہ وسیع و عریض کارخانہ یونہی محض بخت و اتفاق سے معرضِ وجود میں نہیں آگیا بلکہ یہ ایک زبردست اور بے مثال مُدبّر کے حسنِ تدبّر کا نتیجہ ہے۔ یہ مُدبّر یکتا اور بے نیاز ہے اور اس نے کسی دوسری ذات اور قوت کو اپنی ذات، اپنی صفات اور اپنی تدبیر میں شامل نہیں کیا۔ پھر قرآن مجید نے انسان کو اس حقیقت سے بھی آشنا کیا ہے کہ خالق و مخلوق کے درمیان صرف یہی تعلق نہیں کہ خالق نے کائنات کو وجود بخشا بلکہ پیدائش کے بعد بھی یہ قادرِ مطلق اپنی مخلوق کی باقاعدہ نگرانی کر رہا ہے۔ چنانچہ اس کائنات کے اندر جس کو جو کچھ مل رہا ہے اور جس طرح بھی اس کی پرورش ہو رہی ہے وہ سب براہِ راست اسی ربِّ عظیم کی صفتِ ربوبیت کی کرشمہ سازی ہے۔

یہ بے ہمتا ذات ہر جگہ موجود ہے، سب کچھ جانتی اور دیکھتی ہے، ہر آواز کو سنتی ہے، ہر ایک کے قریب اور ہر ایک کے ساتھ ہے۔ اس کا علم پوری کائنات پر محیط ہے۔ وہی ساری کائنات کا اصل بادشاہ اور حاکم ہے اور سب کچھ اُسی کے دستِ تصرف میں ہے۔ اس بااختیار اور لاشریک ہستی نے جو اپنے بندوں پر انتہائی مہربان اور رحیم ہے، ان کے افکار و اعمال اور اُن کے جذبات و احساسات کی صحیح تربیت کا بھی

انتظام کیا ہے۔ اسی مقصد کے لیے اُس نے دنیا کی ہر قوم میں وہ ہادی بھیجے جنہوں نے نہ صرف تعلیمات الٰہی سے انسانوں کو روشناس کیا بلکہ اُن پر عمل پیرا ہو کر تعلیماتِ ربانی کے عملی مضمرات بھی اُن پر واضح کر دیتے۔

یہ ہے مختصر الفاظ میں قرآن مجید کی تعلیم کا خلاصہ۔ اس پر جب ہم غور کرتے ہیں تو تین چیزیں بالکل نمایاں طور پر اُبھر کر ہمارے سامنے آتی ہیں:

ایک یہ کہ اس کائنات کے خالق کو دل کی گہرائیوں سے ماننے بغیر اور پھر اس کے ساتھ رشتۂ عبودیت استوار کیے بغیر انسانی زندگی بالکل بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ دنیا کی کسی مذہبی کتاب نے توحید کا اتنا واضح اور جامع تصور نہیں دیا جتنا کہ قرآن نے دیا ہے۔ دوسرے مذاہب میں جو اب ہمارے درمیان موجود ہیں، اوّل تو توحید کے نقوش ہی واضح نہیں ملتے اور اگر کہیں ان کا پتہ چلتا بھی ہے تو صرف اسی قدر کہ بس ایک خالق کو مان لیا جائے۔ اسلام نے اس سلسلے میں انسان کو یہ بتایا ہے کہ اس کو ایک ماننے کا مطلب یہ نہیں کہ بس اُس کے ساتھ کسی دوسرے کو ساجھی نہ بنایا جائے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ باری تعالیٰ جس طرح اپنی ذات، صفات اور اپنی تدبیر میں یکتا ہے بالکل اسی طرح اُس نے زندگی گزارنے کے جو ضابطے دیتے ہیں اس میں بھی کوئی اس کے مدِ مقابل نہیں ہو سکتا۔ قرآن مجید نے پہلی بار انسان کو اس حقیقت سے آشنا کیا ہے کہ جب خلق اُس کی ہے تو امر بھی اسی کا ہونا چاہیے۔ اگر تکوینی زندگی میں انسان اور ساری کائنات اُس کی تابع ہے تو انسان کو اپنے دائرۂ اختیار میں بھی اُسی کے دیئے ہوئے ضابطوں کی پابندی کرنی چاہیے کیونکہ اس کے بغیر انسان اور کائنات کے درمیان ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس طرزِ فکر اور طرزِ عمل ہی سے قرآن مجید نے انسانی زندگی میں وحدت پیدا کی ہے۔ یہ فکر و نگاہ کا ایک عظیم انقلاب ہے جس نے تاریخِ انسانی پر نہایت گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔

اسلام سے پہلے مذہبی زندگی کا تصوّر یہ تھا کہ انسان کسی مافوق الفطرت ہستی پر ایمان لے آئے اور اس کا نقش دل میں بٹھا کر بس اسی سے اپنی روح کو سیراب کرتا رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان کی اجتماعی زندگی کا مذہب سے کوئی سروکار نہ رہا۔ آپ اگر ان مذاہب کے ماننے والوں کے اندازِ زیست کا جائزہ لیں تو آپ

اُن کے معاشرے میں دو بالکل الگ الگ طبقے پائیں گے۔ ایک وہ طبقہ جسے مذہب کے علاوہ دنیا کی کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں اور دوسرا وہ طبقہ جسے مذہب سے کوئی واسطہ نہیں۔ چنانچہ ان مذاہب کا جب دائرہ کار پھیلا تو ایسی تہذیبیں پروان چڑھیں جو انسانیت کے بالکل دو متضاد نمونے پیش کرتی تھیں۔ متمدن زندگی پر فسق و فجور، خود غرضی، جبر و استبداد اور ناانصافی کی تاریکیاں چھائی ہوئی ہوتیں مگر "روشنی کے مینار" جنگلوں اور صحراؤں کا رُخ کر لیتے۔ مذہب اور عملی زندگی کے اس افتراق نے انسانیت کو جتنا نقصان پہنچایا ہے، شاید ہی کسی اور چیز نے پہنچایا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر زندگی کی عملی جدوجہد میں سے مذہب جیسے لطیف اور پاکیزہ عنصر کو خارج کر دیا جائے تو باقی سوائے مادیت پرستی کے اور کوئی چیز بھی نہیں رہ جاتی۔ مذہب کا یہ غلط تصور انسان کے اندر اتنا رچ بس گیا ہے کہ باوجود ہزار کوشش کے انسان کے ذہن سے یہ ابھی تک نہیں نکلا۔ قرآن مجید نے اس غلط تصور کی بیخ کنی کی اور انسان کو بتایا کہ اُس کی پوری زندگی، اُس کی ساری قوتیں اور صلاحیتیں خالق کی امانت ہیں۔ لہٰذا اس زندگی کے سارے گوشے جب تک احکامِ الٰہی کے مطابق منظم نہیں کیے جاتے اور انسان اپنے سارے معاملات میں خدا کی اطاعت کا رویہ اختیار نہیں کرتا اس وقت تک وہ بندگی کے تقاضوں سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ پھر اُس نے انسان کی اس غلط فہمی کا بھی ازالہ کیا کہ اس کی رُوح اور جسم کے درمیان کوئی باہمی آمیزش ہے۔ روح پر خدا کا تسلط ہے اور مادی زندگی پر شیطان کا اختیار ہے۔ خدا وند تعالیٰ روح اور مادے دونوں کا خالق ہے اور اُس نے انسان کو مادی زندگی، روحانی ارتقا اور ترقی کے لیے عطا کی ہے اور رُوح کو مادی زندگی کی پاکیزگی کا ذریعہ بنایا ہے۔ اس کائنات میں انسان کسی جُرم کی پاداش میں نہیں اُتارا گیا بلکہ اُسے نیک تمناؤں اور مقدس آرزوؤں کے ساتھ اس کرۂ ارضی پر بھیجا گیا ہے تاکہ وہ اپنی اس حیاتِ مستعار میں اپنے عمل سے یہ ثابت کر دے کہ وہ اپنے خالق اور مالک کا مطیع و فرمانبردار بندہ ہے اور دل کی گہرائیوں سے اُسے اپنا رب مانتا ہے۔ دین کے اس جامع تصور نے سیاست، معیشت، معاشرت، سائنس، ادب اور دوسرے علوم و فنون میں نہایت دُور رس تبدیلیاں پیدا کیں۔ سیاست میں حق و صداقت کی عملداری، معیشت میں عدل و انصاف کا چلن، ادب میں اخلاقی اقدار کی ترجمانی اور سائنس میں تحقیق و تلاش کا ایک لازوال جذبہ صرف روحِ قرآنی کا کرشمہ ہے۔

قرآن مجید کو دنیا میں نازل ہوتے صرف چودہ سو سال گزرے ہیں۔ ان چودہ صدیوں میں انسانیت نے جو حیرت انگیز ترقی کی ہے اُسے نگاہ میں رکھ کر قبل از قرآن کی ہزاروں برس کی تاریخ کا جائزہ لیں تو آپ کے سامنے قرآن مجید کا عظیم احسان خود بخود آجائے گا۔ یُوں محسوس ہوتا ہے جیسے قرآن کے نزول سے پہلے انسانیت جو فاصلہ صدیوں میں طے کرتی تھی اُسے اس کتابِ مبین کی روشنی میں اب وہ گھنٹوں میں طے کرنے لگی ہے۔

اہلِ مغرب اس ترقی کو نشاۃ ثانیہ کی کرشمہ سازی سمجھتے ہیں مگر یہ بالکل فریبِ نظر ہے۔ جن علوم کے احیاء کا ان لوگوں کو دعویٰ ہے وہ یونان اور رُوم کے علوم و فنون تھے مگر ہم جدید علوم اور ان کے درمیان غیر معمولی فرق دیکھتے ہیں۔ اگر اسے مسیحیت کا فیضانِ نظر سمجھیں تو معاملہ اور اُلجھ جاتا ہے کیونکہ اُس میں تو ترکِ دنیا کی تعلیم ہے۔ اس کے مطابق تو زندگی کی یہ ساری سرگرمیاں بالکل باطل اور لغو ہیں، جن سے ایک مذہبی آدمی کو ہمیشہ دامن بچا کر چلنا چاہیے۔

اب اگر یہ جدید افکار و نظریات یونانی اور رومی خیالات کا بھی چربہ نہیں اور عیسائیت کے بطن سے بھی پیدا نہیں ہوئے تو آخر یہ کہاں سے آگئے ہیں؟ اس کا جواب ایک ہی ہے کہ قرآن مجید نے دنیا میں آکر لوگوں کے فکر و نگاہ کے زاویوں میں جو بنیادی تبدیلیاں پیدا کیں، یہ سب اُسی کے مظاہر ہیں۔ اہلِ یورپ صلیبی جنگوں کی وجہ سے چڑ اور ضد میں آکر اسلام کے حلقہ بگوش تو نہ بن سکے مگر اس دینِ حق نے جن حیات آفریں تصورات کو جنم دیا تھا ان کی لہریں دنیا کے دور دراز گوشوں تک پہنچیں اور ہر جگہ انسانی معاشرے پر نہایت گہرے اثرات ڈالے۔ ان سارے اثرات میں پہلا اثر احترامِ انسانیت کی صورت میں جلوہ گر ہوا۔

روم، یونان، بابل اور نینوا کی پرانی تہذیبوں میں کوئی ایک تہذیب بھی ایسی نہیں جس میں یہ تصور ملتا ہو کہ انسان بحیثیت انسان ایک قابلِ تکریم ہستی ہے اور اس کے کچھ ایسے مقدس اور بنیادی حقوق ہیں جنہیں کسی صورت بھی پامال نہیں کیا جاسکتا۔ عیسائیت کے ہاں تو انسانیت کی تذلیل اور اُس کے پیدائشی گناہگار ہونے کے علاوہ اور کوئی دوسرا تصور ہی نہیں ملتا۔ رومی اور یونانی بھی انسان کو اجتماعیت کا ایک بے بس کل پرزہ سمجھتے تھے جسے وہ جس طرح چاہتے استعمال کرتے۔ قرآن مجید نے آکر انسانیت کو اُس کی حقیقی قدر و قیمت سے آگاہ کیا اور اُسے بتایا کہ وہ اس کائنات میں خدا کا خلیفہ اور نائب ہے۔ وہ کسی گناہ کی پاداش میں دنیا میں مقید اور گرفتار نہیں ہوا بلکہ

اُسے اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے ایک زریں موقع فراہم کیا گیا ہے۔ وہ اپنی ذات میں بڑی عزت و احترام کا مستحق ہے۔ ادب میں اس تصور نے "رومانیت" کی صورت میں ظہور کیا اور انسان پہلی بار بحیثیت انسان شاعروں اور نثر نگاروں کی توجہ کا مرکز بنا۔ سیاست میں یہ تصور جمہوریت کی صورت میں نمایاں ہوا اور اس نے انسان کو یہ احساس دلایا کہ اُسے اپنے بنیادی حقوق کی حفاظت اور پاسبانی کرنا چاہیے اور معاشرے کے سیاہ و سفید میں اس کی رائے کو بھی دخل ہونا چاہیے۔ انسان بھیڑوں کے گلے نہیں کہ انہیں اقتدار کی لاٹھی جس طرف چاہے ہانک کر لے جائے۔ معاشرت میں اس تصور نے اجتماعی عدل کے احساسات بیدار کیے۔

اس وقت اس امر سے کوئی بحث نہیں کہ ان تحریکات نے غلط رُخ اختیار کرنے کے بعد کون کون سے افسوسناک نتائج پیدا کیے۔ ہمیں یہ بات تسلیم ہے کہ ادب میں جب رومانیت غلط سمت پر چل پڑی تو اس سے فحاشی اور خود پرستی نے جنم لیا۔ سیاست اور معیشت میں جب انفرادیت نے اپنی جائز حدود کو پھاندا تو سیاسی ظلم و استبداد اور معاشی لوٹ کھسوٹ اور اباحیتِ مطلقہ کا دَور دورہ شروع ہوا، لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ یورپ کے جمُود کو اگر کسی چیز نے توڑا تو یہ وہی تصورات تھے جو یورپ میں مسلمان لے کر آئے۔ ان تصورات کے اثر انداز ہونے سے پیشتر سیاست ایک ایسا ناپاک کھیل سمجھا جاتا تھا جس کو کھیلنے کا صرف شیطان کو حق ہے لیکن اسلامی تعلیمات کی وجہ سے سیاست کے بارے میں عوام کے رجحانات بدلے اور عوام نے اس میں دلچسپی لینا شروع کی۔ پھر سیاست میں اجتماعی عدل کا جو تصور پیدا ہوا وہ سراسر اسلامی تعلیمات کا نتیجہ ہے۔ عیسائیت میں تو قیصر کے اس حصے میں کسی انصاف، کسی بھلائی اور کسی خیر کی توقع رکھنا ہی بے سُود ہے۔ اُس کے نزدیک یہ زندگی وہ شعبہ ہے جس میں سوائے مکر و فریب، جور و استبداد اور نا انصافی کے اور کوئی چیز ممکن ہی نہیں ہو سکتی۔ اس بنا پر شیطان کے اس کارخانے کو خدا کی مغضوب مخلوق یعنی بادشاہوں اور فرمانرواؤں کے سپرد رہنا چاہیے۔ عیسائیت میں عدل و انصاف کا بلاشبہ تصور ملتا ہے مگر وہ صرف روحانی بادشاہت میں ہے۔ دنیا کے سیاسی معاملات میں اس کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ قرآن نے حیاتِ انسانی کے اس ملعون اور ناپسندیدہ شعبے کے اندر تقدیس پیدا کی اور انسان کو بتایا کہ اس شعبے کو اگر تعلیماتِ الٰہی کے مطابق ڈھال دیا جائے تو یہ روحانی بادشاہت کی طرح مقدس اور پاکیزہ

ہو جاتا ہے اور اس کے ذریعے انسانوں کے اندر خیر اور بھلائی پیدا کی جاسکتی ہے۔

بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ غیر مسلم بادشاہوں میں بھی بعض بڑے نیک لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے رعایا کے حقوق کا بے حد خیال رکھا اور اسے ہر طرح آرام اور سکون پہنچانے کی کوشش کی۔ یہ بات بالکل درست ہے لیکن اس طرح کی باتیں کرنے والے حضرات غالباً اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ اگر ان خداترس اور نیک فرمانرواؤں نے رعایا کے ساتھ معاملہ کرنے میں خدا خوفی کا ثبوت دیا تو یہ محض اُن کی خداترسی تھی ورنہ اس معاملے میں وہ کسی ضابطے کے پابند نہ تھے اور نہ رعایا کے کسی حق کے احترام میں انہوں نے ایسا کیا۔ یہ اُن کا ایک انفرادی طرزِ عمل تھا۔ اسلام کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ قرآن مجید نے انسان کو مستقل بنیادی حقوق دیئے ہیں جنہیں کسی فرد، ادارے یا حکومت کو سلب کرنے کا حق نہیں اور اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو وہ خدا اور خلق کی نظر میں غاصب ہے۔ اگر بعض غیر مسلم بادشاہوں نے رعایا کے ساتھ خیر اور بھلائی کا رویہ اختیار کیا تو یہ اُن کا احسان تھا مگر مسلمانوں کے ہاں رعایا کے حقوق کی حفاظت اور پاسداری فرمانرواؤں کے فرائض میں داخل ہے اور جن حکمرانوں نے اس سے اغماض برتا انہوں نے خواہ کتنی وسیع و عریض سلطنتیں فتح کیں مگر اسلامی تاریخ میں وہ ۔نت و احترام کا کوئی مقام حاصل نہ کر سکے۔

قرآن نے حکمرانی کے جو اصول انسانیت کو دیئے ہیں اُن کی بنیاد پر مسلمانوں نے لاتعداد کتابیں تصنیف کیں جن میں رعایا کے حقوق و فرائض اور فرماں رواؤں کی ذمہ داریوں کی پوری طرح نشاندہی کی گئی۔ دنیا کی کوئی غیر مسلم قوم اس نوعیت کی کوئی ایک کتاب بھی نہیں دکھا سکتی جس میں کسی کتابِ مقدس کی روشنی میں عملاً ایک سیاسی زندگی کی مثالی طور پر تشکیل کی گئی ہو اور پھر اسے ایک نمونہ سمجھتے ہوتے حکمرانی کے اصول و ضوابط مدون کیے گئے ہوں۔

قرآن مجید نے انسانی فکر و نگاہ میں دوسرا بڑا انقلاب یہ پیدا کیا کہ بنی نوعِ انسان کے درمیان شریف اور کمین کی تفریق مٹا کر عزت اور ذلت کی بنیاد حسب و نسب اور رنگ و نسل کے بجائے ایمان اور اخلاق کو قرار دیا۔ اس کا یہ اعلان کتنا انقلاب انگیز ہے:

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (الحجرات-۱۳)

اے لوگو! ہم نے تم سب، کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تم کو مختلف قومیں اور خاندان بنا دیا ہے کہ ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بے شک تم میں سے جو اللہ سے زیادہ ڈرنے والا ہے وہی معزز تر ہے۔

پھر سورۃ النساء کا آغاز ہی اس حقیقت کے بیان سے کیا گیا ہے:

يَا اَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ۔

اے لوگو! اپنے پروردگار سے تقویٰ اختیار کرو جس نے تم سب کو ایک ہی جان سے پیدا کیا۔

یہ دو آیتیں ہم نے بطور مثال پیش کی ہیں ورنہ قرآن مجید نے ایک مقام پر نہیں متعدد مقامات پر اسی حقیقت کی وضاحت کی ہے کہ انسان نے انسان کے درمیان شریف اور کمین کی جو تفریق پیدا کر رکھی ہے اور رنگ و نسل کے امتیازات کی وجہ سے جو گروہ بندیاں قائم کر رکھی ہیں یہ سراسر باطل ہیں۔ دنیا کے سارے انسان ایک ماں باپ کی اولاد ہیں اور اس بنا پر ان کے درمیان کسی قسم کی تفریق جائز نہیں۔ ہاں ان کے اندر اگر امتیاز کیا جا سکتا ہے تو وہ صالح اعمال کی بنا پر کیا جا سکتا ہے۔ یعنی خدا سے ڈرنے والے اور انسانیت کی خیر اور بھلائی چاہنے والے، خدا سے غافل اور انسانیت کے دشمنوں اور بدخواہوں سے ممیز اور ممتاز ہیں۔

وحدتِ نوعِ انسانی، اسلام میں ایک نظریہ نہیں بلکہ مؤکد حقیقت ہے۔ اس نے اُن تمام جاہلی نظریات کی جڑ کاٹ کر رکھ دی جو انسانوں کی مختلف نسلوں کو مختلف مورثوں کی اولاد سمجھتے ہیں۔ پھر اس نے مختلف قبائل، خاندانوں اور نسلوں کے بارے میں یہ بات بتا کر کہ ان کا مقصد باہمی تعارف کے علاوہ اور کچھ نہیں جدید و قدیم جاہلانہ قوم پرستی اور نسل پرستی کا قلع قمع کیا ہے اور انسان کے دل و دماغ میں اس بات کو راسخ کیا ہے کہ اللہ کے ہاں شرف و مقبولیت کا تمام تر دار و مدار صرف نیکی پر ہے۔ یہ نسلی، قومی اور آبائی غرور سب باطل اوہام ہیں جن میں مبتلا ہو کر انسان نے انسانیت کی فطری وحدت کو پارا پارا کیا ہے۔ انسان جس نتیجے پر لمبی تحقیقات کے بعد آج بیسویں صدی میں پہنچا ہے اُس حقیقت کو قرآن مجید نے آج سے چودہ سو برس پہلے واضح کر دیا تھا۔ یونسکو نے جولائی ۱۹۵۰ء میں ماہرینِ حیاتیات کی ایک رپورٹ شائع کی تھی جس میں اس امر کا

جائزہ لیا گیا کہ انسانوں کے درمیان رنگ و نسل کے جو اختلافات پائے جاتے ہیں ان کی نوعیت کیا ہے۔ اس رپورٹ نے قرآن مجید کی اس صداقت کا مندرجۂ ذیل الفاظ میں اعتراف کیا۔

" سارے سائنس دان اب اس بات پر متفق اور متحد ہیں کہ انسانیت اصل کے اعتبار سے ایک ہی ہے اور سارے انسان ایک ہی نوع سے تعلق رکھتے ہیں۔ حیاتیات کے مطالعہ سے جو نتائج اخذ کیے گئے ہیں انہوں نے عالمگیر برادری کے قیام کا راستہ ہموار کر دیا ہے۔ انسان فطرتاً دوسرے انسان سے تعاون اور محبت کا خواہاں ہے اور اگر اس کی یہ آرزو پوری نہ ہو تو اسے دکھ ہوتا ہے۔ انسان کے اندر معاشرتی احساسات پائے جاتے ہیں اور وہ ابنائے جنس کے تعاون ہی سے ان کی تسکین کر سکتا ہے۔ جب انسان اور انسان کے مابین اس فطری رشتہ اخوت کی نفی کی جاتی ہے تو پھر سوائے انتشار کے اور کوئی چیز پیدا نہیں ہوتی۔ اس نقطۂ نظر سے ہر انسان دوسرے انسان کا دمساز ہے کیونکہ ہر فرد انسانیت کی وسیع برادری کا ایک رکن ہے۔"

قرآن مجید نے ہمیں صرف وحدت انسانی کا ہی درس نہیں دیا بلکہ اُس نے وحدتِ فکر اور وحدتِ احساس کی بھی تعلیم دی ہے۔ اُس نے جہاں انسان کے سامنے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ سب انسان ایک باپ کی اولاد ہیں وہاں اس نے اس حقیقت کو بھی منکشف کیا ہے کہ حاکم مطلق نے بندوں کی ہدایت کے لیے جو دین انہیں عطا کیا ہے وہ اپنی اساس اور بنیاد کے اعتبار سے ایک ہی ہے اور ہمیشہ ایک ہی رہا ہے۔ اس کے اساسی تصورات میں اگر مختلف گروہوں کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے تو یہ اُن کی کم فہمی اور ناسمجھی کا نتیجہ ہے۔ مالک الملک نے اپنے بندوں کو ایک ہی پیغام دیا ہے اور یہی بات قرینِ قیاس بھی ہے۔ جب ہدایت کا سرچشمہ ایک ہے جب انسانوں کے مابین بحیثیت انسان کوئی فرق و امتیاز نہیں تو لامحالہ ان کے لیے ہدایت کا ضابطہ اور فلاح و کامرانی کا راستہ بھی ایک ہی ہونا چاہیے۔ اسی حقیقت کو قرآن مجید نے یوں ارشاد فرمایا ہے:

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ

ابتدا میں سب لوگ ایک ہی طریقے پر تھے۔ (پھر یہ حالت باقی نہ رہی، اور اختلافات رونما ہوئے) تب اللہ نے

اُلْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ۔ (البقرہ - ۲۱۳)

نبی بھیجے جو راست روی پر بشارت دینے والے اور کجروی کے نتائج سے ڈرانے والے تھے اور ان کے ساتھ کتاب برحق نازل کی تا کہ حق کے بارے میں لوگوں کے درمیان جو اختلافات رونما ہو گئے تھے ان کا فیصلہ کرے اور ان اختلافات کی وجہ کچھ یہ نہ تھی کہ ابتدا میں لوگوں کو حق بتایا نہ گیا تھا، نہیں، اختلاف ان لوگوں نے کیا، جنہیں حق کا علم دیا جا چکا تھا۔ انہوں نے روشن ہدایت پا لینے کے بعد محض اس لیے حق کو چھوڑ کر مختلف طریقے نکالے کہ وہ آپس میں زیادتی کرنا چاہتے تھے۔

وحدتِ انسانی کی طرح وحدتِ پیغامِ الٰہی بھی ایک ایسی واضح حقیقت ہے جس کا قرآن مجید نے بار بار اظہار کیا ہے۔ فکری انتشار اور گروہی تعصبات اسلام کے نزدیک قطعاً کوئی پسندیدہ چیزیں نہیں۔ قرآن مجید نے اس حقیقت پر سے پردہ اٹھایا ہے کہ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں جس میں باری تعالیٰ نے اپنے ہادی نہ بھیجے ہوں۔ یہ سارے ہادی خدا کی طرف سے انسان کی رہنمائی کے لیے مبعوث ہوئے تھے اور یہ سب کے سب ایک ہی پیغام کے داعی، ایک ہی تعلیم کے حامل، ایک ہی راستہ کے رہنما اور ایک ہی دعوت کے علمبردار تھے۔ ان کے درمیان قطعاً کوئی اختلاف نہ تھا۔ وہ سب نبوت کے مقدس سلسلہ کی مختلف کڑیاں تھے۔ قرآن مجید نے ان بزرگ و برتر ہستیوں کی صداقت اور ان کے پیغام کی حقانیت کی تصدیق کی ہے اور بتایا ہے کہ یہ سب جو تعلیمات لیکر دنیا میں آئے تھے ان پر ایمان لائے بغیر ایمان کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ وحدتِ فکر اور وحدتِ احساس کی اس سے بڑی اور بہتر مثال اور کہاں مل سکتی ہے کہ انسان ایک خدا کی مخلوق، ایک آدم کی اولاد اور ہدایت کے ایک ہی سرچشمے سے ہدایت پانے والا ہے۔

حق و صداقت کے دشمنوں نے قرآن مجید کے اس ارشاد کی، کہ ابتدا میں تمام بنی نوع انسان ایک ہی امت تھے، تکذیب کے لیے بڑے عجیب و غریب فلسفے گھڑے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ انسان سب سے پہلے مظاہر پرست تھا۔ اس مظاہر پرستی سے اس نے بت پرستی کا سبق سیکھا اور بالآخر اس نے ان دیکھے خدا کی پرستش شروع کی

لیکن حال ہی میں اس موضوع پر جو تحقیقات ہوئی ہیں انہوں نے ان سب اوہام کو باطل قرار دیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ انسان فطرتاً موحد، ایک خدا کا پرستار اور کفر و شرک سے بیزار ہے۔ اس کا اصل دین ہمیشہ توحید ہی رہا ہے اور اس نے نفسانی خواہشات اور غلط مقاصد کے تحت اس سے منہ موڑا۔ ہم یہاں تاریخ مذہب کے چند نامور ماہرین کی تصریحات پیش کرتے ہیں:

سر چارلس مارسٹن جو دورِ حاضر کا نامور ماہر آثارِ قدیمہ اور انسانیات ہے اُس نے اس حقیقت کا مندرجہ ذیل لفظوں میں اعتراف کیا ہے:

"انسان کا اصل مذہب شرک نہ تھا بلکہ توحید تھا۔ ارتقاء مذہب کے نظریہ کو انسانیات اور آثارِ قدیمہ کی تحقیقات نے باطل قرار دیا ہے۔"

ایک دوسرا مفکر لینگڈن (LANGDN) اسی موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"میرے نزدیک مذہب کی پوری تاریخ توحید سے شرک کی طرف انسان کے زوال کی داستان ہے۔ دنیا کے قدیم کتب خانوں میں ہمیں جو پرانی تحریریں اور تختیاں ملی ہیں انہیں دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ انسان شروع میں توحید پرست اور آخرت پر ایمان رکھنے والا تھا۔"

قرآن مجید کے عظیم احسانات میں عورتوں کو بھی خاصا حصہ ملا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو طبقہ جتنا مظلوم تھا باری تعالیٰ نے اتنا ہی اُسے مظلومیت سے نجات دلانے کا التزام فرمایا۔ خدا کی اس آخری کتاب کے نزول سے پیشتر عورت کی حیثیت محض ایک کھلونے یا سامانِ عیش سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ وہ بے جان اشیاء کی طرح ایک مرد سے دوسرے مرد کی تحویل میں چلی جاتی اور کسی فرد کے انتقال کے بعد اس کے وارث کے پاس دوسرے اثاثے کی طرح منتقل ہو جاتی۔ یہ خاندان کے لیے کلنک کا ٹیکہ تصور کی جاتی اور ظالم والدین اسے ایک ناروا بوجھ سمجھ کر اُسے زندہ دفن کر دیتے۔ اُس کے متعلق لوگوں کے اندر یہ بات مشہور تھی کہ اس کا خمیر گناہ سے اٹھایا گیا ہے۔ اور اسی وجہ سے اُس نے ابوالبشر حضرت آدم علیہ السّلام کو جنت سے نکلوا دیا تھا۔ ایک مرد جتنی عورتوں کو چاہتا بلا تکلف اپنے حرم میں لے آتا، نکاح محض ایک رسم تھی جس میں نہ تو کوئی تقدیس تھی اور نہ اس سے کسی ذمہ داری کا تصور وابستہ تھا۔ آپ کو اگر عورت کی مظلومیت کا کچھ اندازہ

کرنا مقصود ہو تو رابرٹسن سمتھ کی کتاب "رشتہ اور نکاح عرب قبل از اسلام" کا مطالعہ کیجیے۔ اس سے آپ کو معلوم ہو گا کہ یہ صنفِ نازک کس قسم کے ظلم و استبداد کا شکار تھی۔ ایک عورت کو بیک وقت کئی کئی مردوں کی بیوی بن کر رہنا پڑتا اور بسا اوقات پورے خاندان کے مرد اُسے اپنی ہوسناکی کا ہدف بناتے۔ اس کا کام صرف اسی قدر تھا کہ وہ مرد کی تفریح کا سامان پیدا کرے۔ مشہور مفسر زمخشری نے اپنی تفسیر کشاف میں سورۃ التکویر کی ایک آیت کی تصریح کرتے ہوئے وہ طریقہ بیان کیا ہے جس کے مطابق بچیاں موت کے گھاٹ اتاری جاتی تھیں۔ وہ فرماتے ہیں :

"جب بچی کی عمر چھ برس کی ہو جاتی تو خاوند بیوی کو کہتا کہ اسے خوشبو لگاؤ اور زیور سے آراستہ کرو۔ پھر یہ خاوند اس بے بس بچی کو اپنے رشتہ داروں کے ہاں ملاقات کے لیے لے جاتا اور آخر جنگل کا رخ کرتا۔ وہاں ایک گڑھا کھودتا اور اس مظلومہ کو اس کے کنارے کھڑے ہونے کا حکم دیتا اور اُس سے کہتا کہ تم اس گڑھے کی طرف غور سے دیکھو۔ اس حالت میں اُسے پیچھے سے دھکا دے کر اس گڑھے میں گرا دیتا اور اس کے اوپر مٹی ڈال کر اُسے زمین کے ساتھ ہموار کر دیتا۔

جب ایک عورت کسی خاندان میں چلی جاتی تو اُس کی آزادی یکسر سلب ہو جاتی۔ وہ اُس خاندان کی ملکیت تصور ہوتی۔ اُسے اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں سے ملنے کی قطعاً اجازت نہ ہوتی اور وہ بالکل ایک بے جان مخلوق کی طرح بڑے عذاب میں زندگی بسر کرتی۔ کامل المبرّد میں بنی عامر کی ایک عورت کا نوحہ درج ہے جو اُس نے اپنے نکاح پر پڑھا۔ اس سے عورت کی بے بسی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے :

"بہن کو اپنے بھائی کی مدح و ستائش سے دامن کش ہو جانا چاہیے۔

اب بیٹی کو باپ کی موت پر نوحہ خواں ہونے سے بھی باز رہنا چاہیے، کیونکہ اب وہ ایک ایسی جگہ منتقل ہو گئی ہے جہاں اس کی آزادی مسلوب ہے۔

اس کے لواحقین نے اُسے دنیا کے ایسے دُور دراز گوشے میں بھیج دیا ہے جہاں وہ اپنے کسی عزیز سے مل نہیں سکتی۔"

ابن جریر نے اپنی مشہور تفسیر طبری میں وہ طریقہ بیان کیا ہے جس کے تحت عورت اپنے خاوند کی وفات کے بعد اُس کے وارثوں کی طرف منتقل ہوتی۔ بیوہ کے حقوقِ مالکانہ حاصل کرنے کے لیے اُس پر ایک چادر ڈال

دی جاتی جو اس بات کی علامت تھی کہ اب یہ عورت چادر ڈالنے والے کے قبضے میں آچکی ہے۔ اگر یہ بدنصیب خوبصورت ہوتی تو اس کا نیا مالک اُسے اپنے پاس رکھ لیتا، ورنہ وہ اُسے دوسرے ہاتھوں میں بڑی بے تکلفی کے ساتھ فروخت کر دیتا۔

عورت کو جب ذی رُوح مخلوق ہی تصور نہ کیا جاتا تھا اور وہ جب انسانیت کے دائرے سے ہی خارج خیال کی جاتی تھی تو اُس کے احترام اور اُس کے حقوق کا سوال آخر کس طرح پیدا ہو سکتا تھا۔ وراثت میں حصّہ تو خیر بڑی چیز ہے، اُس کا انسانیت میں بھی کوئی حصّہ نہ تھا۔ وہ شیطان کی اولاد تصور کی جاتی، جس کے ذمہ صرف یہی کام تھا کہ وہ انسانی سفلی جذبات کی تسکین کا سامان فراہم کرے۔

قرآن مجید نے اس مظلوم طبقے پر اس قدر احسانات کیے ہیں کہ اُن کا شمار نہیں ہو سکتا۔ اس ضمن میں اُس نے سب سے پہلے اس بات کی تردید و تکذیب کی کہ عورت کا تعلق شیطان سے ہے۔ قرآن مجید نے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ عورت بھی اسی طرح ایک ذی رُوح اور قابلِ احترام مخلوق ہے جس طرح کہ مرد کیونکہ دونوں ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں۔ دونوں پر اپنے اعمال کی الگ الگ ذمّہ داری عائد ہوتی ہے اور کسی ایک کو دوسرے کے افعال کے لیے ذمہ دار نہیں ٹھیرایا جا سکتا۔ (النساء، آیت ۳۲)

اسی طرح قرآن مجید نے میراث میں لڑکی کو اپنے بھائی کا حصہ دار بنایا اور خاوند کی وفات کے بعد اُس کے ترکے میں سے اُسے ایک مستقل حصے کا وارث قرار دیا۔ ماں باپ پر اُس کی پرورش کی ذمہ داریاں عائد کیں اور اُن سے عہدہ برا ہونے کی انہیں تاکید کی اور والدین سے رخصت ہونے کے بعد جب وہ رشتۂ مناکحت کے تحت اپنے خاوند کے گھر میں منتقل ہوئی تو وہاں بھی اُس کے مستقل حقوق کا تعین کیا گیا۔ مرد پر اس کے نان و نفقہ کی ذمہ داری ڈالی گئی، اور مرد کو اس بات کا پابند کیا گیا کہ وہ اس کے ساتھ نرمی اور بھلائی کا برتاؤ کرے۔ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوتے وقت اس کی رضامندی کو ضروری سمجھا گیا اور اُسے یہ اختیار دیا گیا کہ اگر وہ اپنے خاوند کے ساتھ نباہ نہیں کر سکتی تو خلع کے ذریعہ اُس سے علیٰحدگی اختیار کر لے۔

قرآن مجید کے عورت پر احسانات کی فہرست اتنی طویل ہے کہ اس کے لیے یہ صفحات ناکافی ہیں۔ ہم یہاں ایک غیر مسلم خاتون کے تاثرات نقل کرتے ہیں:

"محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے سے پیشتر عورت معاشرے میں نہایت ذلیل چیز تصور کی جاتی تھی، اُس کی حیثیت بے جان اشیا کی سی تھی۔ یہ سب کچھ یہودی راہبوں کی تعلیمات کا نتیجہ تھا..... ذلت و خواری اس کا مقدر بن چکی تھی۔ وہ گھر کے دوسرے سامان کی طرح ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہوتی رہتی، اور وارث جس طرح چاہتا اُس سے فائدہ اٹھاتا۔ اس کی محافظت اور نگہبانی کا کوئی سامان موجود نہ تھا۔ کوئی قانون ایسا نہ تھا جو اُسے پناہ دیتا۔ ترکہ میں اُس کے لیے کوئی حصہ نہ تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ اللہ وسلم کو عورت کی یہ مظلومیت کسی طرح گوارا نہ تھی۔ انہوں نے اس بے بس مخلوق کو ذلت کے مقام سے اٹھا کر مردوں کے دوش بدوش عزت و احترام کے مقام پر کھڑا کیا۔ اور مرد اور عورت کے درمیان مساوات کی تعلیم دی۔ انہوں نے مردوں کے اپنے حرم میں عورتوں کے بے قید داخلہ پر پابندی لگائی۔ انہوں نے بچیوں کو زندہ دفن کرنے کی رسم کا یکسر خاتمہ کیا۔ انہوں نے رشتۂ نکاح کو تقدس دیا۔ عورتوں کو وراثت اور خلع کے حقوق عطا فرمائے۔ مرد پر عورت کے نان و نفقہ کی ذمہ داریاں عائد کیں۔ اس کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یتیموں اور بیواؤں کی پرورش کرنے والوں اور اُن کی معاونت اور دستگیری کرنے والوں کی خدا کے ہاں اجرِ عظیم کا مستحق ٹھیرایا۔ حضورؐ نے تہذیب کے ارتقا اور ترقی میں عورتوں کی خدمات کو پوری طرح تسلیم کیا اور اس بنا پر اُن کی روحانی اور اخلاقی نشو و نما کو نظامِ اسلامی میں بہت زیادہ اہمیت دی۔ اُس دور میں جب حضورؐ دنیا میں تشریف لائے، دنیا کے تمدن میں یہ غیر معمولی انقلاب تھا اور اس سے جو تبدیلیاں ہوئیں انہیں کسی دور میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

(مس فلوری، "مسلم ورلڈ" نیویارک جنوری ۱۹۴۰ء)

یہ تبدیلیاں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے محض قانونی تبدیلیاں ہیں۔ عورت کے بارے میں قرآن مجید نے فکر و نگاہ کے زاویوں کو کس طرح بدلا ہے یہ خود ایک مستقل موضوع ہے جو بڑی تفصیل چاہتا ہے۔ ہم یہاں صرف ایک دو گزارشات پیش کرتے ہیں۔ سورۃ النساء میں جس میں زیادہ تر عورتوں اور یتیموں کے حقوق بیان کیے گئے ہیں، باری تعالیٰ نے بار بار لوگوں کے ذہن میں یہ بات بٹھائی ہے کہ وہ اُن کی ساری کارروائیوں کو جاننے والا، دیکھنے والا اور اُن کی نگرانی

کرنے والا ہے۔ خداوند تعالیٰ نے اپنی یہ صفت خفیٰ مرتبہ یہاں دُہرائی ہے غالباً کسی اور مقام پر نہیں دُہرائی۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ گھریلو معاملات اس نوعیت کے نہیں ہوتے کہ وہ سارے قانونی پابندیوں کی گرفت میں آسکیں۔ خصوصاً خاوند اور بیوی کا رشتہ تو ایسا ہے کہ کوئی قانونی پابندی اسے سنوار نہیں سکتی۔ لہٰذا ان تعلقات میں خدا کا خوف ہی ہمیشہ ملحوظ خاطر رہنا چاہیے۔ اور دونوں فریقوں کو یہ حقیقت پوری طرح ذہن میں رکھنی چاہیے کہ وہ اگرچہ قانون کی گرفت سے تو بچ سکتے ہیں، یا ایک فریق دوسرے فریق پر کسی حیلۂ قانونی کے ذریعے سے زیادتی تو کر سکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ سے جو علیم و خبیر ہے اس کا یہ فعل کس طرح چھپا رہ جائے گا۔ قرآن مجید نے رشتۂ مناکحت کو نہ صرف مقدس بنایا ہے بلکہ اس نے قادر مطلق کو اس پر گواہ بھی ٹھہرایا ہے۔

پھر اس کتابِ الٰہی میں عورت کے وجود کا جو مقصد بیان کیا گیا ہے اس کی نظیر دنیا کے کسی دوسرے مذہب میں نہیں ملتی۔ قرآن مجید کی رُو سے عورت نہ تو کھلونا ہے اور نہ مرد کے لیے سامانِ عیش، بلکہ وہ ایک ایسی ذات ہے جو اُس کے لیے آرام و سکون کا نہایت مؤثر ذریعہ بن سکتی ہے۔ مثلاً سورۂ اعراف میں ہے: جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا۔ پھر سورۂ روم میں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے: وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً۔ ان آیات سے تین باتیں بالکل کھل کر سامنے آتی ہیں۔ اول یہ کہ عورتیں ترکیبِ حیات میں مردوں کی مثل ہی ہیں، یعنی انھی جیسی خواہشات، جذبات اور احساسات رکھنے والی مخلوق ہیں۔ دوم یہ کہ اُن کی غایتِ آفرینش یہ ہے کہ وہ مردوں کے لیے سرمایۂ راحت و تسکین و باعثِ سکونِ خاطر ہیں۔ سوم یہ کہ مرد اور عورت کے تعلقات کی بنیاد باہمی محبت، اخلاص اور ہمدردی پر ہونی چاہیے۔ قرآن مجید نے عورت کو شیطان کی اولاد، چڑیل، مرد کو گناہ کی ترغیب دینے والی یا اُس کی کنیز نہیں ٹھیرایا بلکہ اُسے اس کی انیس اور رفیق قرار دیا ہے۔

قرآن نے عورت کے وجود کا جو مقصد بیان کیا ہے اُسے اگر نگاہ میں رکھ کر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ عورت آج بھی اُسی طرح مظلوم ہے جس طرح کہ آج سے چودہ سو برس پہلے مظلوم تھی۔ مغربی عورت کو اپنی ترقی اور آزادی پر بڑا ناز ہے لیکن یہ ترقی محض فریبِ نظر ہے۔ مرد آج بھی اُسے اپنی ہوسناکی کا نشانہ بنا رہا ہے۔ (باقی ص ۶۲ پر)

تفہیم القرآن

الحشر

(۲)

اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے

اللہ ہی کی تسبیح کی ہے ہر اُس چیز نے جو آسمانوں اور زمین میں ہے، اور وہی غالب اور حکیم ہے[1]۔
وہی ہے جس نے اہلِ کتاب کافروں کو پہلے ہی حملے میں[2] اُن کے گھروں سے نکال باہر کیا[3]۔ تمہیں ہرگز

---

[1] تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، تفسیر سورۂ الحدید، حاشیہ ۱ و ۲۔ بنی نضیر کے اخراج پر تبصرہ شروع کرنے سے پہلے یہ تمہیدی فقرہ ارشاد فرمانے سے مقصود ذہن کو یہ حقیقت سمجھنے کے لیے تیار کرنا ہے کہ اس طاقتور یہودی قبیلے کے ساتھ جو معاملہ پیش آیا وہ مسلمانوں کی طاقت کا نہیں بلکہ اللہ کی قدرت کا کرشمہ تھا۔

[2] اصل الفاظ ہیں لِاَوَّلِ الْحَشْرِ۔ حشر کے معنی ہیں منتشر افراد کو اکٹھا کرنا، یا بکھرے ہوئے اشخاص کو جمع کر کے نکالنا۔ اور لِاَوَّلِ الْحَشْر کے معنی ہیں پہلے حشر کے ساتھ یا پہلے حشر کے موقع پر۔ اب رہا یہ سوال کہ اس جگہ اوّلِ حشر سے مراد کیا ہے، تو اس میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ ایک گروہ کے نزدیک اس سے مراد بنی نضیر کا مجموعی اخراج ہے، اور اس کو اُن کا پہلا حشر اِس معنی میں کہا گیا ہے کہ اُن کا دوسرا حشر حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ہُوا جب یہود و نصاریٰ کو جزیرۃ العرب سے نکالا گیا، اور آخری حشر قیامت کے روز ہوگا۔ دوسرے گروہ کے نزدیک اس سے مراد مسلمانوں کی فوج کا اجتماع ہے جو بنی نضیر سے جنگ کرنے کے لیے ہُوا تھا۔ اور لِاَوَّلِ الْحَشْر کے معنی یہ ہیں کہ ابھی مسلمان اُن سے لڑنے کے لیے جمع ہی ہوئے تھے اور کشت و خون کی نوبت بھی نہ آئی تھی کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے وہ جلاوطنی کے لیے تیار ہو گئے۔ بالفاظ دیگر یہاں یہ الفاظ باوّلِ وہلہ کے معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے اس کا ترجمہ کیا ہے

یہ گمان نہ تھا کہ وہ نکل جائیں گے، اور وہ بھی یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ اُن کی گڑھیاں انہیں اللہ سے بچا لیں گی۔ مگر

" دراوّلِ جمع کردنِ لشکر"۔ اور شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ ہے" پہلے ہی بھیڑ ہوتے"۔ ہمارے نزدیک یہ دوسرا مفہوم ہی ان الفاظ کا قابلِ ترجیح مفہوم ہے۔

ﷺ اس مقام پر ایک بات آغاز ہی میں سمجھ لینی چاہیے تاکہ بنی نضیر کے اخراج کے معاملہ میں کوئی ذہنی الجھن پیدا نہ ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بنی نضیر کا باقاعدہ تحریری معاہدہ تھا۔ اس معاہدے کو انہوں نے رد نہیں کیا تھا کہ معاہدہ ختم ہو جاتا۔ لیکن جس وجہ سے ان پر چڑھائی کی گئی وہ یہ تھی کہ انہوں نے بہت سی چھوٹی بڑی خلاف ورزیاں کرنے کے بعد آخرکار ایک صریح فعل ایسا کیا تھا جو نقضِ عہد کا ہم معنی تھا۔ وہ یہ کہ انہوں نے دوسرے فریقِ معاہدہ، یعنی مدینہ کی اسلامی ریاست کے صدر کو قتل کرنے کی سازش کی تھی اور وہ کچھ اس طرح کھل گئی تھی کہ جب ان کو نقضِ معاہدہ کا الزام دیا گیا تو وہ اس کا انکار نہ کر سکے۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دس دن کا نوٹس دے دیا کہ اس مدت میں مدینہ چھوڑ کر نکل جاؤ ورنہ تمہارے خلاف جنگ کی جائے گی۔ یہ نوٹس قرآن مجید کے اس حکم کے ٹھیک مطابق تھا کہ "اگر تم کو کسی قوم سے خیانت (بدعہدی) کا اندیشہ ہو تو اس کے معاہدے کو علانیہ اس کے آگے پھینک دو" (الانفال۔ ۵۸)۔ اسی لیے ان کے اخراج کو اللہ تعالیٰ اپنا فعل قرار دے رہا ہے، کیونکہ یہ ٹھیک قانونِ الٰہی کے مطابق تھا۔ گویا ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں نے نہیں بلکہ اللہ نے نکالا۔ دوسری وجہ جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ان کے اخراج کو اپنا فعل قرار دیا ہے آگے کی آیات میں ارشاد فرمائی گئی ہے۔

ﷺ اِس ارشاد کو سمجھنے کے لیے یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ بنی نضیر صدیوں سے یہاں جمے ہوئے تھے۔ مدینہ کے باہر ان کی پوری آبادی یکجا تھی جس میں ان کے اپنے قبیلے کے سوا کوئی دوسرا عنصر موجود نہ تھا۔ انہوں نے پوری بستی کو قلعہ بند کر رکھا تھا، اور ان کے مکانات بھی گڑھیوں کی شکل میں بنے ہوئے تھے جس طرح عموماً قبائلی علاقوں میں جہاں ہر طرف بدامنی پھیلی ہوئی ہو، بنائے جاتے ہیں۔ پھر ان کی تعداد بھی اُس وقت کے مسلمانوں سے کچھ کم نہ تھی۔ اور خود مدینے کے اندر بہت سے منافقین اُن کی پشت پر تھے۔ اس لیے مسلمانوں کو ہرگز یہ توقع نہ تھی کہ یہ لوگ لڑے بغیر صرف محاصرے ہی سے بدحواس ہو کر یوں اپنی جگہ چھوڑ دیں گے۔ اسی طرح خود بنی نضیر کے بھی وہم و گمان میں یہ بات نہ تھی کہ کوئی طاقت ان سے چھ دن کے اندر یہ جگہ چھڑا لے گی۔ اگرچہ بنی قینقاع ان سے پہلے نکالے جا چکے تھے اور اپنی شجاعت پر ان کا سارا

زعم وعوا کا دھرا رہ گیا تھا، لیکن وہ مدینہ کے ایک محلّے میں آباد تھے اور ان کی اپنی کوئی الگ قلعہ بند بستی نہ تھی، اس لیے بنی نضیر یہ سمجھتے تھے کہ اُن کا مسلمانوں کے مقابلے میں نہ ٹھیر سکنا بعید از قیاس نہ تھا۔ بخلاف اس کے وہ اپنی محفوظ بستی اور اپنی مضبوط گڑھیوں کو دیکھ کر یہ خیال بھی نہ کر سکتے تھے کہ کوئی انہیں یہاں سے نکال سکتا ہے۔ اسی لیے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دس دن کے اندر مدینہ سے نکل جانے کا نوٹس دیا تو انہوں نے بڑے دھڑلے کے ساتھ جواب دے دیا کہ ہم نہیں نکلیں گے، آپ سے جو کچھ ہو سکتا ہے کر لیجیے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آخر یہ بات کس بنا پر فرمائی کہ "وہ یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ ان کی گڑھیاں انہیں اللہ سے بچا لیں گی"؟ کیا واقعی بنی نضیر یہ جانتے تھے کہ ان کا مقابلہ محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے نہیں بلکہ اللہ سے ہے؟ اور کیا یہ جانتے ہوئے بھی اُن کا یہ خیال تھا کہ اُن کی گڑھیاں اُنہیں اللہ سے بچا لیں گی؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو ہر اُس شخص کے ذہن میں اُلجھن پیدا کرے گا جو یہودی قوم کے نفسیات اور ان کی صدہا برس کی روایات کو نہ جانتا ہو۔ عام انسانوں کے متعلق کوئی یہ گمان نہیں کر سکتا کہ وہ شعوری طور پر یہ جانتے بھی ہوں کہ مقابلہ اللہ سے ہے اور پھر بھی ان کو یہ زعم لاحق ہو جائے کہ اُن کے قلعے اور ہتھیار انہیں اللہ سے بچا لیں گے۔ اس لیے ایک ناواقف آدمی اس جگہ اللہ تعالیٰ کے کلام کی یہ تاویل کرے گا کہ بنی نضیر بظاہر اپنے قلعوں کا استحکام دیکھ کر اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حملہ سے بچ جائیں گے، مگر حقیقت یہ تھی کہ ان کا مقابلہ اللہ سے تھا اور اُس سے اُن کے قلعے اُنہیں نہ بچا سکتے تھے۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہودی اِس دنیا میں ایک ایسی عجیب قوم ہے جو جانتے بوجھتے اللہ کا مقابلہ کرتی رہی ہے، اللہ کے رسولوں کو یہ جانتے ہوئے اس نے قتل کیا ہے کہ وہ اللہ کے رسول ہیں، اور فخر کے ساتھ سینہ ٹھونک کر اس نے کہا ہے کہ ہم نے اللہ کے رسول کو قتل کیا۔ اِس قوم کی روایات یہ ہیں کہ اُن کے مورثِ اعلیٰ حضرت یعقوبؑ سے اللہ تعالیٰ کی رات بھر کُشتی ہوتی رہی اور صبح تک لڑ کر بھی اللہ تعالیٰ ان کو نہ پچھاڑ سکا۔ پھر جب صبح ہو گئی اور اللہ تعالیٰ نے اُن سے کہا اب مجھے جانے دے تو انہوں نے کہا میں تجھے نہ جانے دونگا جب تک تو مجھے برکت نہ دے۔ اللہ تعالیٰ نے پوچھا تیرا نام کیا ہے؟ انہوں نے کہا یعقوب۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آئندہ تیرا نام یعقوب نہیں بلکہ اسرائیل ہو گا، کیونکہ تو نے خدا اور آدمیوں کے ساتھ زور آزمائی کی اور غالب ہوا" ملاحظہ ہو یہودیوں کا جدید ترین ترجمۂ کتب مقدسہ (THE HOLY SCRIPTURES) شائع کردہ جیوش پبلیکیشن سوسائٹی آف امریکہ ۱۹۵۴ء کتاب

اللہ ایسے رُخ سے اُن پر آیا جدھر اُن کا خیال بھی نہ گیا تھا؎۔ اُس نے اُن کے دلوں میں رُعب ڈال دیا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے بھی اپنے گھروں کو برباد کر رہے تھے اور مومنوں کے ہاتھوں بھی برباد کروا رہے تھے۔

پیدائش، باب ۳۲۔ آیات ۲۵ تا ۲۹۔ عیسائیوں کے ترجمہ بائبل میں بھی یہ مضمون اسی طرح بیان ہوا ہے۔ یہودی ترجمہ کے حاشیہ میں "اسرائیل" کے معنی لکھے گئے ہیں: HE WHO STRIVETH WITH GOD، یعنی "جو خدا سے زور آزمائی کرے"۔ اور سائیکلو پیڈیا آف ببلیکل لٹریچر میں عیسائی علماء نے اسرائیل کے معنی کی تشریح یہ کی ہے: WRESTLER WITH GOD۔ "خدا سے کُشتی لڑنے والا"۔ پھر بائیبل کی کتاب ہوسیع میں حضرت یعقوب کی تعریف یہ بیان کی گئی ہے کہ "وہ اپنی توانائی کے ایام میں خدا سے کُشتی لڑا۔ وہ فرشتے سے کُشتی لڑا اور غالب آیا" (باب ۱۲۔ آیت ۴)۔ اب ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل آخر اُن حضرت اسرائیل کے صاحبزادے ہی تو ہیں جنہوں نے ان کے عقیدے کے مطابق خدا سے زور آزمائی کی تھی اور اس سے کُشتی لڑی تھی۔ اُن کے لیے آخر کیا مشکل ہے کہ خدا کے مقابلے میں یہ جانتے ہوئے بھی ڈٹ جائیں کہ مقابلہ خدا سے ہے۔ اسی بنا پر تو انہوں نے خود اپنے اعترافات کے مطابق خدا کے نبیوں کو قتل کیا اور اسی بنا پر انہوں نے حضرت عیسیٰ کو اپنے زعم میں صلیب پر چڑھایا اور خم ٹھونک کر کہا اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ (ہم نے مسیح عیسیٰ ابن مریم رسول اللہ کو قتل کیا)۔ لہٰذا یہ بات ان کی روایات کے خلاف نہ تھی کہ انہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول جانتے ہوئے ان کے خلاف جنگ کی۔ اگر ان کے عوام نہیں تو اُن کے ربّی اور اَحبار تو خوب جانتے تھے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اس کے متعدد شواہد خود قرآن میں موجود ہیں۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اوّل۔ البقرہ، حاشیہ ۷۹-۹۵۔ النساء، حاشیہ ۱۹۰-۱۹۱۔ جلد چہارم، الصافات، حاشیہ ۷۰-۷۳)۔

؎ اللہ کا اُن پر آنا اس معنی میں نہیں ہے کہ اللہ کسی اور جگہ تھا اور پھر وہاں سے اُن پر حملہ آور ہُوا۔ بلکہ یہ مجازی کلام ہے۔ اصل مدعا یہ تصور دلانا ہے کہ اللہ سے مقابلہ کرتے ہوئے وہ اِس خیال میں تھے کہ اللہ تعالیٰ اُن پر صرف اِسی شکل میں بلا لے کر آسکتا ہے کہ ایک لشکر کو سامنے سے اُن پر چڑھا کر لائے، اور وہ سمجھتے تھے کہ اس بلا کو تو ہم اپنی قلعہ بندیوں سے روک لیں گے۔ لیکن اس نے ایسے راستہ سے اُن پر حملہ کیا جدھر سے کسی بلا کے آنے کی وہ کوئی توقع نہ رکھتے تھے۔ اور وہ راستہ یہ تھا کہ اس نے اندر سے اُن کی ہمت اور قوتِ مقابلہ کو کھوکھلا کر دیا جس کے بعد نہ اُن کے ہتھیار کسی کام آسکتے تھے نہ اُن کے مضبوط گڑھ۔

پس عبرت حاصل کرو اے دیدۂ بینا رکھنے والو!ؔ

ؔ یعنی تباہی دو طرح سے ہوئی۔ باہر سے مسلمانوں نے محاصرہ کر کے ان کی قلعہ بندیوں کو توڑنا شروع کیا۔ اور اندر سے خود انہوں نے پہلے تو مسلمانوں کا راستہ روکنے کے لیے جگہ جگہ پتھروں اور لکڑیوں کی رکاوٹیں کھڑی کیں اور اس غرض کے لیے اپنے گھروں کو توڑ توڑ کر ملبہ جمع کیا۔ پھر جب ان کو یقین ہو گیا کہ انہیں یہاں سے نکلنا ہی پڑے گا تو انہوں نے اپنے گھروں کو، جنہیں کبھی بڑے شوق سے بنایا اور سجایا تھا، اپنے ہی ہاتھوں برباد کرنا شروع کر دیا تاکہ وہ مسلمانوں کے کام نہ آسکیں۔ اس کے بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انہوں نے اس شرط پر صلح کی کہ ہماری جانیں بخش دی جائیں اور ہمیں اجازت دی جائے کہ ہتھیاروں کے سوا جو کچھ بھی ہم یہاں سے اٹھا کر لے جاسکتے ہیں لے جائیں تو چلتے ہوئے وہ اپنے دروازے اور کھڑکیاں اور کھونٹیاں تک اکھاڑ لے گئے، حتیٰ کہ بعض لوگوں نے شہتیر اور لکڑی کی چھتیں تک اپنے اونٹوں پر لاد لیں۔

ؔ اس واقعہ میں عبرت کے کئی پہلو ہیں جن کی طرف اِس مختصر سے بلیغ فقرے میں اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ یہودی آخر پچھلے انبیاء کی امت ہی تو تھے۔ خدا کو مانتے تھے۔ کتاب کو مانتے تھے۔ پچھلے انبیاء کو مانتے تھے۔ آخرت کو مانتے تھے۔ اس لحاظ سے دراصل وہ سابق مسلمان تھے۔ لیکن جب انہوں نے دین اور اخلاق کو پس پشت ڈال کر محض اپنی خواہشاتِ نفس اور دنیوی اغراض و مفاد کی خاطر کھلی کھلی حق دشمنی اختیار کی اور خود اپنے عہد و پیمان کا بھی کوئی پاس نہ کیا تو اللہ تعالیٰ کی نگاہِ التفات ان سے پھر گئی۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اللہ کو ان سے کوئی ذاتی عداوت نہ تھی۔ اس لیے سب سے پہلے تو خود مسلمانوں کو ان کے انجام سے عبرت دلائی گئی ہے کہ کہیں وہ بھی اپنے آپ کو یہودیوں کی طرح خدا کی چہیتی اولاد نہ سمجھ بیٹھیں اور اس خیالِ خام میں مبتلا نہ ہو جائیں کہ خدا کے آخری نبیؐ کی امت میں ہونا ہی بجائے خود ان کے لیے اللہ کے فضل اور اس کی تائید کی ضمانت ہے جس کے بعد دین و اخلاق کے کسی تقاضے کی پابندی ان کے لیے ضروری نہیں رہتی۔ اس کے ساتھ دنیا بھر کے اُن لوگوں کو بھی اس واقعہ سے عبرت دلائی گئی ہے جو جان بوجھ کر حق کی مخالفت کرتے ہیں اور پھر اپنی دولت و طاقت اور اپنے ذرائع و وسائل پر یہ اعتماد کرتے ہیں کہ یہ چیزیں ان کو خدا کی پکڑ سے بچالیں گی۔ مدینہ کے یہودی اس سے ناواقف نہ تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کسی قوم یا قبیلہ کی سربلندی کے لیے نہیں اٹھے ہیں بلکہ ایک اصولی دعوت پیش کر رہے ہیں جس کے مخاطب سارے انسان ہیں اور ہر انسان، قطع نظر اس سے کہ وہ کسی نسل یا ملک سے تعلق رکھتا ہو اس دعوت کو قبول کر کے ان کی امت میں بلا امتیاز شامل ہو سکتا ہے۔ اُن کی آنکھوں کے سامنے حبش کے بلالؓ، روم کے

اگر اللہ نے اُن کے حق میں جلا وطنی نہ لکھ دی ہوتی تو دنیا ہی میں وہ انہیں عذاب دے ڈالتا،[ﮧ] اور آخرت میں تو ان کے لیے دوزخ کا عذاب ہے ہی۔ یہ سب کچھ اس لیے ہُوا کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کا مقابلہ کیا، اور جو بھی اللہ کا مقابلہ کرے اللہ اس کو سزا دینے میں بہت سخت ہے۔

مہتبہؔ اور فارس کے سَلمانؓ کو امّتِ مسلمہ میں وہی حیثیت حاصل تھی جو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے اہل خاندان کو حاصل تھی۔ اس لیے ان کے سامنے یہ کوئی خطرہ نہ تھا کہ قریش اور اَوس اور خزرج ان پر مسلط ہو جائیں گے۔ وہ اس سے بھی ناواقف نہ تھے کہ آپ جو اصولی دعوت پیش فرما رہے ہیں وہ بعینہٖ وہی ہے جو خود ان کے اپنے انبیاء پیش کرتے رہے ہیں۔ آپ کا یہ دعویٰ نہ تھا کہ مَیں ایک نیا دین لے کر آیا ہوں جو پہلے کبھی کوئی نہ لایا تھا اور تم اپنا دین چھوڑ کر میرا یہ دین مان لو۔ بلکہ آپ کا دعویٰ یہ تھا کہ یہ وہی دین ہے جو ابتدائے آفرینش سے خدا کے تمام انبیاء لاتے رہے ہیں اور اپنی توراۃ سے وہ خود اس کی تصدیق کر سکتے تھے کہ فی الواقع یہ وہی دین ہے، اس کے اصولوں میں دینِ انبیاء کے اصولوں سے کوئی فرق نہیں ہے۔ اسی بنا پر تو قرآن مجید میں ان سے کہا گیا تھا کہ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ (ایمان لاؤ میری نازل کردہ اُس تعلیم پر جو تصدیق کرتی ہے اُس تعلیم کی جو تمہارے پاس پہلے سے موجود ہے، اور سب سے پہلے تم ہی اس کے کافر نہ بن جاؤ)۔ پھر اُن کی آنکھیں یہ بھی دیکھ رہی تھیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کس سیرت و اخلاق کے انسان ہیں، اور آپ کی دعوت قبول کر کے لوگوں کی زندگیوں میں کیسا عظیم انقلاب برپا ہوا ہے۔ انصار تو مدتِ دراز سے ان کے قریب ترین پڑوسی تھے۔ اسلام لانے سے پہلے ان کی جو حالت تھی اسے بھی یہ لوگ دیکھ چکے تھے اور اسلام لانے کے بعد ان کی جو حالت ہو گئی وہ بھی ان کے سامنے موجود تھی۔ پس دعوت اور داعی اور دعوت قبول کرنے کے نتائج، سب کچھ ان پر عیاں تھے لیکن یہ ساری باتیں دیکھتے اور جانتے ہوئے بھی انہوں نے محض اپنے نسلی تعصبات اور اپنے دنیوی مفاد کی خاطر اُس چیز کے خلاف اپنی ساری طاقت لگا دی جس کے حق ہونے میں کم از کم ان کے لیے شک کی گنجائش نہ تھی۔ اس دانستہ حق دشمنی کے بعد وہ یہ توقع رکھتے تھے کہ ان کے قلعے انہیں خدا کی پکڑ سے بچا لیں گے۔ حالانکہ پوری انسانی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ خدا کی طاقت جس کے مقابلے میں آجائے وہ پھر کسی ہتھیار سے نہیں بچ سکتا۔

ﮧ دنیا کے عذاب سے مراد ہے ان کا نام و نشان مٹا دینا۔ اگر وہ صلح کر کے اپنی جانیں بچانے کے بجائے

تم لوگوں نے کھجوروں کے جو درخت کاٹے یا جن کو اپنی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا، یہ سب اللہ ہی کے اذن سے تھا۔[۹] اور (اللہ نے یہ اذن اس لیے دیا) تاکہ فاسقوں کو ذلیل و خوار کرے۔[۱۰]

ٹھنے تو ان کا پُورا طرح قلع قمع ہو جاتا۔ ان کے مرد مارے جاتے اور ان کی عورتیں اور ان کے بچے لونڈی غلام بنا لیے جاتے جنہیں فدیہ دے کر چھڑانے والا بھی کوئی نہ ہوتا۔

۹۔ یہ اشارہ ہے اِس معاملہ کی طرف کہ مسلمانوں نے جب محاصرہ شروع کیا تو بنی نضیر کی بستی کے اطراف میں جو نخلستان واقع تھے ان کے بہت سے درختوں کو انہوں نے کاٹ ڈالا یا جلا دیا تاکہ محاصرہ بآسانی کیا جا سکے، اور جو درخت فوجی نقل و حرکت میں حائل نہ تھے ان کو کھڑا رہنے دیا۔ اس پر مدینہ کے منافقین اور بنی قریظہ اور خود بنی نضیر نے شور مچا دیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو فساد فی الارض سے منع کرتے ہیں، مگر یہ دیکھ لو، ہرے بھرے پھل دار درخت کاٹے جا رہے ہیں، یہ آخر فساد فی الارض نہیں تو کیا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا کہ تم لوگوں نے جو درخت کاٹے اور جن کو کھڑا رہنے دیا، ان میں سے کوئی فعل بھی ناجائز نہیں ہے، بلکہ دونوں کو اللہ کا اذن حاصل ہے۔ اس سے یہ شرعی مسئلہ نکلتا ہے کہ جنگی ضروریات کے لیے جو تخریبی کارروائی ناگزیر ہو وہ فساد فی الارض کی تعریف میں نہیں آتی بلکہ فساد فی الارض یہ ہے کہ کسی فوج پر جنگ کا بھوت سوار ہو جائے اور وہ دشمن کے ملک میں گھس کر کھیت، مویشی، باغات، عمارات، ہر چیز کو خواہ مخواہ تباہ و برباد کرتی پھرے۔ اس معاملہ میں عام حکم تو وہی ہے جو حضرت ابو بکر صدیق نے فوجوں کو شام کی طرف روانہ کرتے وقت دیا تھا کہ پھل دار درختوں کو نہ کاٹنا، فصلوں کو خراب نہ کرنا، اور بستیوں کو ویران نہ کرنا۔ یہ قرآن مجید کی اِس تعلیم کے عین مطابق تھا کہ اس نے مُفسد انسانوں کی مذمت کرتے ہوئے اُن کے اِس فعل پر زجر و توبیخ کی ہے کہ "جب وہ اقتدار پا جاتے ہیں تو فصلوں اور نسلوں کو تباہ کرتے پھرتے ہیں" (البقرہ۔ ۲۰۵)۔ لیکن جنگی ضروریات کے لیے خاص حکم یہ ہے کہ اگر دشمن کے خلاف لڑائی کو کامیاب کرنے کی خاطر کوئی تخریب ناگزیر ہو تو وہ کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود نے اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے یہ وضاحت فرما دی ہے کہ قطعوا منہا ما کان موضعاً للقتال "مسلمانوں نے بنی نضیر کے درختوں میں سے صرف وہ درخت کاٹے تھے جو جنگ کے مقام پر واقع تھے" (تفسیر نیسا بوری)۔ فقہائے اسلام میں سے بعض نے معاملہ کے اس پہلو کو نظر انداز کر کے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ بنی نضیر کے درخت کاٹنے کا جواز صرف اِسی واقعہ کی حد تک مخصوص تھا، اس سے یہ عام جواز نہیں نکلتا کہ جب کبھی جنگی ضروریات داعی ہوں، دشمن کے درختوں کو کاٹا اور جلایا

جاسکے۔ امام اَوزاعی، لَیث اور ابو ثَور اسی طرف گئے ہیں۔ لیکن جمہور فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ اہم جنگی ضروریات کے لیے ایسا کرنا جائز ہے۔ البتہ محض تخریب و غارت گری کے لیے یہ فعل جائز نہیں ہے۔

ایک شخص یہ سوال کرسکتا ہے کہ قرآن مجید کی یہ آیت مسلمانوں کو تو مطمئن کرسکتی تھی، لیکن جو لوگ قرآن کو کلام اللہ نہیں مانتے تھے انہیں اپنے اعتراض کے جواب میں یہ سُن کر کیا اطمینان ہوسکتا تھا کہ یہ دونوں فعل اللہ کے اذن کی بنا پر جائز ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کی یہ آیت مسلمانوں ہی کو مطمئن کرنے کے لیے نازل ہوئی ہے، کفار کو مطمئن کرنا سرے سے اس کا مقصود ہی نہیں ہے۔ چونکہ یہود اور منافقین کے اعتراض کی وجہ سے، یا بطورِ خود مسلمانوں کے دلوں میں یہ خلش پیدا ہوگئی تھی کہ کہیں ہم فساد فی الارض کے مرتکب تو نہیں ہوگئے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو اطمینان دلا دیا کہ محاصرے کی ضرورت کے لیے کچھ درختوں کو کاٹنا، اور جو درخت محاصرے میں حائل نہ تھے ان کو نہ کاٹنا، یہ دونوں ہی فعل قانونِ الٰہی کے مطابق درست ہیں۔

محدثین کی نقل کردہ روایات میں اس امر پر اختلاف ہے کہ آیا ان درختوں کے کاٹنے اور جلانے کا حکم خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا، یا مسلمانوں نے بطورِ خود یہ کام کیا اور بعد میں اس کا شرعی مسئلہ حضورؐ سے دریافت کیا۔ حضرت عبداللہ بن عمر کی روایت یہ ہے کہ حضورؐ نے خود اس کا حکم دیا تھا (بخاری، مسلم، مسند احمد، ابن جریر)۔ یہی یزید بن رُومان کی روایت بھی ہے (ابن جریر)۔ بخلاف اس کے مجاہد اور قتادہ کی روایت یہ ہے کہ مسلمانوں نے بطورِ خود یہ درخت کاٹے تھے، پھر ان میں اس مسئلے پر اختلاف ہوا کہ یہ کام کرنا چاہیے یا نہیں۔ بعض اس کے جواز کے قائل ہوئے اور بعض نے اس سے منع کیا۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما کر دونوں کے فعل کی تصویب کردی (ابن جریر)۔ اسی کی تائید حضرت عبداللہ بن عباس کی یہ روایت کرتی ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں اس بات پر خلش پیدا ہوئی کہ ہم میں سے بعض نے درخت کاٹے ہیں اور بعض نے نہیں کاٹے، اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھنا چاہیے کہ ہم میں سے کس کا فعل اجر کا مستحق ہے اور کس کے فعل پر مواخذہ ہوگا (نسائی)۔ فقہاء میں سے جن لوگوں نے پہلی روایت کو ترجیح دی ہے وہ اس سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد تھا جس کی توثیق بعد میں اللہ تعالیٰ نے وحی جلی سے فرمائی اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ جن معاملات میں اللہ تعالیٰ کا حکم موجود نہ ہوتا تھا ان میں حضورؐ اجتہاد پر عمل فرماتے تھے۔ دوسری طرف جن فقہاء نے دوسری روایت کو ترجیح دی ہے وہ اس سے

اور جو مال اللہ نے اُن کے قبضے سے نکال کر اپنے رسول کی طرف پلٹا دیئے ﷺ، وہ ایسے مال نہیں ہیں جن پر تم نے

یہ استدلال کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے دو گروہوں نے اپنے اپنے اجتہاد سے دو مختلف رائیں اختیار کی تھیں اور اللہ تعالیٰ نے دونوں کی توثیق فرما دی، لہٰذا اگر نیک نیتی کے ساتھ اجتہاد کر کے اہلِ علم مختلف رائیں قائم کریں تو باوجود اس کے کہ ان کی آرا ایک دوسرے سے مختلف ہوں گی، مگر اللہ کی شریعت میں وہ سب حق پر ہوں گے۔

۱۰ یعنی اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ ان درختوں کو کاٹنے سے بھی ان کی ذلّت و خواری ہو اور نہ کاٹنے سے بھی۔ کاٹنے میں ان کی ذلّت و خواری کا پہلو یہ تھا کہ جو باغ انہوں نے اپنے ہاتھوں لگائے تھے اور جن باغوں کے وہ مدتہائے دراز سے مالک چلے آرہے تھے، اُن کے درخت اُن کی آنکھوں کے سامنے کاٹے جارہے تھے اور وہ کاٹنے والوں کو کسی طرح نہ روک سکتے تھے۔ ایک معمولی کسان اور باغبان بھی اپنے کھیت یا باغ میں کسی دوسرے کے تصرف کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر اس کے سامنے اس کا کھیت یا اس کا باغ کوئی برباد کر رہا ہو تو وہ اس پر کٹ مرے گا۔ اور اگر وہ اپنی جائیداد میں دوسرے کی دست درازی نہ روک سکے تو یہ اس کی انتہائی ذلّت اور کمزوری کی علامت ہوگی۔ لیکن یہاں ایک پورا قبیلہ، جو صدیوں سے بڑے دھڑلے کے ساتھ اِس جگہ آباد تھا، بڑی بے بسی کے ساتھ یہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے ہمسائے اس کے باغوں پر چڑھ آئے ہیں اور اس کے درختوں کو برباد کر رہے ہیں، مگر وہ ان کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ اس کے بعد اگر وہ مدینے میں رہ بھی جاتے تو ان کی کوئی آبرو باقی نہ رہتی۔ رہا درختوں کو نہ کاٹنے میں ذلّت کا پہلو تو وہ یہ تھا کہ جب وہ مدینہ سے نکلے تو اُن کی آنکھیں یہ دیکھ رہی تھیں کہ کل تک جو ہرے بھرے باغ ان کی ملکیت تھے وہ آج مسلمانوں کے قبضے میں جارہے ہیں۔ اُن کا بس چلتا تو وہ اُن کو پوری طرح اجاڑ کر جاتے اور ایک سالم درخت بھی مسلمانوں کے قبضے میں نہ جانے دیتے۔ مگر بے بسی کے ساتھ وہ سب کچھ جُوں کا تُوں چھوڑ کر باحسرت و یاس نکل گئے۔

۱۱ اب اُن جائدادوں اور املاک کا ذکر ہو رہا ہے جو پہلے بنی نضیر کی ملک تھیں اور ان کی جلاوطنی کے بعد اسلامی حکومت کے قبضے میں آئیں۔ ان کے متعلق یہاں سے آیت ۱۰ تک اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ ان کا انتظام کس طرح کیا جائے۔ چونکہ یہ پہلا موقع تھا کہ ایک علاقہ فتح ہو کر اسلامی مقبوضات میں شامل ہوا، اور آگے بہت سے علاقے فتح ہونے والے تھے، اس لیے فتوحات کے آغاز ہی میں اراضی مفتوحہ کا قانون بیان فرما دیا گیا۔ اِس جگہ قابلِ غور بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مَآ اَفَآءَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مِنْھُمْ (جو کچھ پلٹا دیا اُن سے اللہ نے اپنے رسول کی طرف)، کے الفاظ استعمال

اپنے گھوڑے اور اونٹ دوڑاتے ہوں، بلکہ اللہ اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا ہے تسلط عطا فرما دیتا ہے، اور
اللہ ہر چیز پر قادر ہے[۱۲]۔ جو کچھ بھی اللہ ان بستیوں کے لوگوں سے اپنے رسول کی طرف پلٹا دے وہ اللہ اور

گئے ہیں۔ ان الفاظ سے خود بخود یہ معنی نکلتے ہیں کہ یہ زمین اور وہ ساری چیزیں جو یہاں پائی جاتی ہیں، دراصل اُن لوگوں کا حق نہیں ہیں جو اللہ جل شانہ کے باغی ہیں۔ وہ اگر ان پر قابض و متصرف ہیں تو یہ حقیقت میں اس طرح کا قبضہ و تصرف ہے جیسے کوئی خائن ملازم اپنے آقا کا مال دبا بیٹھے۔ ان تمام اموال کا اصل حق یہ ہے کہ یہ ان کے حقیقی مالک، اللہ رب العٰلمین کی اطاعت میں اس کی مرضی کے مطابق استعمال کیے جائیں، اور ان کا یہ استعمال صرف مومنین صالحین ہی کر سکتے ہیں۔ اس لیے جو اموال بھی ایک جائز و برحق جنگ کے نتیجے میں کفار کے قبضے سے نکل کر اہلِ ایمان کے قبضے میں آئیں ان کی حقیقی حیثیت یہ ہے کہ اُن کا مالک انہیں اپنے خائن ملازموں کے قبضے سے نکال کر اپنے فرمانبردار ملازموں کی طرف پلٹا لایا ہے۔ اسی لیے ان املاک کو اسلامی قانون کی اصطلاح میں فَے (پلٹا کر لائے ہوئے اموال) قرار دیا گیا ہے۔

[۱۲] یعنی اِن اموال کی نوعیت یہ نہیں ہے کہ جو فوج میدانِ جنگ میں دشمن سے نبرد آزما ہوئی ہے اُس نے لڑ کر اِن کو جیتا ہو اور اس بنا پر اُس فوج کا یہ حق ہو کہ یہ اموال اس میں تقسیم کر دیے جائیں، بلکہ اِن کی اصل نوعیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اپنے رسولوں کو، اور اُس نظام کو جس کی نمائندگی یہ رسول کرتے ہیں، ان پر غلبہ عطا کر دیا ہے۔ بالفاظ دیگر ان کا مسلمانوں کے قبضے میں آنا براہ راست لڑنے والی فوج کے زورِ بازو کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ یہ اُس مجموعی قوت کا نتیجہ ہے جو اللہ نے اپنے رسول اور اس کی اُمت اور اس کے قائم کردہ نظام کو عطا فرمائی ہے۔ اس لیے یہ اموال مالِ غنیمت سے بالکل مختلف حیثیت رکھتے ہیں اور لڑنے والی فوج کا یہ حق نہیں ہے کہ غنیمت کی طرح ان کو بھی اس میں تقسیم کر دیا جائے۔

اس طرح شریعت میں غنیمت اور فَے کا حکم الگ الگ کر دیا گیا ہے۔ غنیمت کا حکم سورۂ انفال آیت ۴۱ میں ارشاد ہوا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس کے پانچ حصے کیے جائیں، چار حصے لڑنے والی فوج میں تقسیم کر دیے جائیں، اور ایک حصہ بیت المال میں داخل کر کے اُن مصارف میں صرف کیا جائے جو اُس آیت میں بیان کیے گئے ہیں۔ اور فَے کا حکم یہ ہے کہ اسے فوج میں تقسیم نہ کیا جائے، بلکہ وہ پُوری کی پُوری اُن مصارف کے لیے مخصوص کر دی جائے جو آگے کی آیات میں بیان ہو رہے ہیں۔ ان دونوں قسم کے اموال میں فرق فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ (تم نے اس پر اپنے گھوڑے اور اونٹ نہیں دوڑائے ہیں)، کے الفاظ سے ظاہر کیا گیا ہے۔ گھوڑے اور اونٹ دوڑانے سے مراد ہے جنگی

کارروائی (WAR LIKE OPERATIONS) لہٰذا جو مال براہِ راست اس کارروائی سے ہاتھ آئے ہوں وہ غنیمت ہیں اور جن اموال کے حصول کا اصل سبب یہ کارروائی نہ ہو وہ سب فئے ہیں۔

یہ مجمل فرق جو غنیمت اور فئے کے درمیان اس آیت میں بیان کیا گیا ہے، اس کو اور زیادہ کھول کر فقہائے اسلام نے اس طرح بیان کیا ہے کہ غنیمت صرف وہ اموالِ منقولہ ہیں جو جنگی کارروائیوں کے دوران میں دشمن کے لشکروں سے حاصل ہوں۔ ان کے ماسوا دشمن ملک کی زمینیں، مکانات اور دوسرے اموالِ منقولہ و غیر منقولہ غنیمت کی تعریف سے خارج ہیں۔ اس تشریح کا ماخذ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وہ خط ہے جو انہوں نے حضرت سعد بن ابی وقاص کو فتح عراق کے بعد لکھا تھا۔ اس میں وہ فرماتے ہیں کہ فانظر ما اجلبوا بہ علیك فی العسکر من کراع او مال فاقسمہ بین من حضر من المسلمین واترك الارضین والانھار لعمّالھا لیکون ذالك فی اعطیات المسلمین "جو مال متاع فوج کے لوگ تمہارے لشکر میں سمیٹ لائے ہیں اس کو ان مسلمانوں میں تقسیم کردو جو جنگ میں شریک تھے اور زمینیں اور نہریں ان لوگوں کے پاس چھوڑ دو جو ان پر کام کرتے ہیں تاکہ ان کی آمدنی مسلمانوں کی تنخواہوں کے کام آئے" (کتاب الخراج لابی یوسف صفحہ ۲۴۔ کتاب الاموال لابی عبید صفحہ ۵۹۔ کتاب الخراج لیحیٰی بن آدم صفحات ۲۷۔ ۲۸۔ ۴۸)۔ اسی بنیاد پر حضرت حسن بصری کہتے ہیں کہ "جو کچھ دشمن کے کیمپ سے ہاتھ آئے وہ ان کا حق ہے جنہوں نے اس پر فتح پائی اور زمین مسلمانوں کے لیے ہے" (یحیٰی بن آدم صفحہ ۲۷)۔ اور امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ "جو کچھ دشمن کے لشکروں سے مسلمانوں کے ہاتھ آئے اور جو متاع اور اسلحہ اور جانور وہ اپنے کیمپ میں سمیٹ لائیں وہ غنیمت ہے اور اسی میں سے پانچواں حصہ نکال کر باقی چار حصے فوج میں تقسیم کیے جائیں گے" (کتاب الخراج، صفحہ ۱۸)۔ یہی رائے یحیٰی بن آدم کی ہے جو انہوں نے اپنی کتاب الخراج میں بیان کی ہے (صفحہ ۲۷)۔ اس سے بھی زیادہ جو چیز غنیمت اور فئے کے فرق کو واضح کرتی ہے وہ یہ ہے کہ جنگ نہاوند کے بعد جب مالِ غنیمت تقسیم ہو چکا تھا اور مفتوحہ علاقہ اسلامی حکومت میں داخل ہو گیا تھا، ایک صاحب، سائب بن اقرع کو قلعہ میں جواہر کی دو تھیلیاں ملیں۔ ان کے دل میں یہ الجھن پیدا ہوئی کہ آیا یہ مالِ غنیمت ہے جسے فوج میں تقسیم کیا جائے، یا اس کا شمار اب فئے میں ہے جسے بیت المال میں داخل ہونا چاہیے؟ آخر کار انہوں نے مدینہ حاضر ہو کر معاملہ حضرت عمرؓ کے سامنے پیش کیا اور انہوں نے فیصلہ فرمایا کہ اسے فروخت کر کے اس کی قیمت بیت المال میں داخل کر دی جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ غنیمت صرف وہ اموالِ منقولہ ہیں جو دورانِ جنگ میں فوج کے ہاتھ آئیں۔ جنگ ختم ہونے

رسول اور رشتہ داروں اور یتامیٰ اور مساکین اور مسافروں کے لیے ہے[۱۳] تاکہ وہ تمہارے مالداروں ہی کے درمیان

کے بعد اموال غیر منقولہ کی طرح اموال منقولہ بھی فَے کے حکم میں داخل ہو جاتے ہیں۔ امام ابو عبید اس واقعہ کو نقل کر کے لکھتے ہیں، «ما نیل من اھل الشرک عَنوۃً قسرًا والحرب قائمۃ فھو الغنیمۃ، وما نیل منہم بعد ما تضع الحرب اوزارھا وتصیر الدار دار الاسلام فھو فَیءٌ یکون للناس عامًّا ولا خمس فیہ» "جو مال دشمن سے بزور ہاتھ لگے جبکہ ابھی جنگ ہو رہی ہو، وہ غنیمت ہے، اور جنگ ختم ہونے کے بعد جب ملک دارالاسلام بن گیا ہو، اُس وقت جو مال ہاتھ لگے وہ فَے ہے جسے عام باشندگان دارالاسلام کے لیے وقف ہونا چاہیے۔ اس میں خُمس نہیں ہے" (کتاب الاموال، صفحہ ۲۵۴)۔

غنیمت کو اس طرح محدود کرنے کے بعد باقی جو اموال واملاک اور اراضی کفار سے مسلمانوں کی طرف منتقل ہوں وہ دو بڑی اقسام پر تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔ ایک وہ جو لڑ کر فتح کیے جائیں، جن کو اسلامی فقہ کی زبان میں عَنوۃً فتح ہونے والے ممالک کہا جاتا ہے۔ دوسرے وہ جو صلح کے نتیجے میں مسلمانوں کے ہاتھ آئیں، خواہ وہ صلح اپنی جگہ پر مسلمانوں کی فوجی طاقت کے دباؤ یا رُعب اور ہیبت ہی کی وجہ سے ہوئی ہو۔ اور اسی قسم میں وہ سب اموال بھی آجاتے ہیں جو عَنوۃً فتح ہونے کے سوا کسی دوسری صورت سے مسلمانوں کے قبضے میں آئیں۔ فقہائے اسلام کے درمیان جو کچھ بحثیں پیدا ہوئی ہیں وہ صرف پہلی قسم کے اموال کے بارے میں پیدا ہوئی ہیں کہ ان کی ٹھیک ٹھیک شرعی حیثیت کیا ہے کیونکہ وہ فما اوجفتم علیہ من خیل ولا رکاب کی تعریف میں نہیں آتے۔ رہے دوسری قسم کے اموال، تو ان کے بارے میں یہ بات متفق علیہ ہے کہ وہ فَے ہیں، کیونکہ ان کا حکم صاف صاف قرآن مجید میں بیان کر دیا گیا ہے۔ آگے چل کر ہم قسمِ اول کے اموال کی شرعی حیثیت پر تفصیل کلام کریں گے۔

[۱۳] پچھلی آیت میں صرف اتنی بات ارشاد ہوئی تھی کہ ان اموال کو حملہ آور فوج میں غنائم کی طرح تقسیم نہ کرنے کی وجہ کیا ہے، اور کیوں ان کا شرعی حکم غنائم سے الگ ہے۔ اب اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ ان اموال کے حقدار کون کون ہیں۔

ان میں سب سے پہلا حصہ اللہ اور رسول کا ہے۔ اِس حکم پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح عمل کیا اُس کی تفصیل مالک بن اَوس بن الحدثان نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے یہ نقل کی ہے کہ حضور اس حصہ میں سے اپنا اور

اپنے اہل و عیال کا نفقہ لے لیتے تھے اور باقی آمدنی جہاد کے لیے اسلحہ اور سواری کے جانور فراہم کرنے پر خرچ فرماتے تھے (بخاری، مسلم، مُسند احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی وغیرہ)۔ حضورؐ کے بعد یہ حصّہ مسلمانوں کے بیت المال کی طرف منتقل ہوگیا تاکہ یہ اُس مشن کی خدمت پر صرف ہو جو اللہ نے اپنے رسول کے سپرد کیا تھا۔ امام شافعیؒ سے یہ رائے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ خاص کے لیے جو حصّہ تھا وہ آپ کے بعد آپ کے خلیفہ کے لیے ہے، کیونکہ آپ اس کے مستحق اپنے منصبِ امامت کی بنا پر تھے نہ کہ منصبِ رسالت کی بنا پر۔ مگر فقہائے شافعیہ کی اکثریت کا قول اس معاملہ میں وہی ہے جو جمہور کا قول ہے کہ یہ حصّہ اب مسلمانوں کے دینی و اجتماعی مصالح کے لیے ہے، کسی شخص خاص کے لیے نہیں ہے۔

دوسرا حصّہ رشتہ داروں کا ہے، اور ان سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے رشتہ دار ہیں، یعنی بنی ہاشم اور بنی المُطّلِب۔ یہ حصّہ اس لیے مقرر کیا گیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اپنی ذات اور اپنے اہل و عیال کے حقوق ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے اُن رشتہ داروں کے حقوق بھی ادا فرما سکیں جو آپ کی مدد کے محتاج ہوں، یا آپ جن کی مدد کرنے کی ضرورت محسوس فرمائیں۔ حضورؐ کی وفات کے بعد یہ بھی ایک الگ اور مستقل حصّہ کی حیثیت سے باقی نہیں رہا، بلکہ مسلمانوں کے دوسرے مساکین، یتامیٰ اور مسافروں کے ساتھ بنی ہاشم اور بنی المطلب کے محتاج لوگوں کے حقوق بھی بیت المال کے ذمّہ عائد ہوگئے، البتہ اس بنا پر ان کا حق دوسروں پر فائق سمجھا گیا کہ زکوٰۃ میں اُن کا حصّہ نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت ہے کہ حضرات ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم کے زمانے میں پہلے دو حصّے ساقط کر کے صرف باقی تین حصّے (یتامیٰ، مساکین و ابن السبیل) فے کے حقداروں میں شامل رہنے دیئے گئے، پھر اسی پر حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے اپنے زمانے میں عمل کیا۔ محمد بن اسحاق نے امام محمد بن باقر کا قول نقل کیا ہے کہ اگرچہ حضرت علیؓ کی ذاتی رائے وہی تھی جو ان کے اہلِ بیت کی رائے تھی (کہ یہ حصّہ حضورؐ کے رشتہ داروں کو ملنا چاہیے) لیکن انہوں نے ابوبکر و عمر کی رائے کے خلاف عمل کرنا پسند نہ فرمایا۔ حسن بن محمد بن حَنَفِیّہ کہتے ہیں کہ حضورؐ کے بعد ان دونوں حصوں (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے حصّے اور ذوی القربیٰ کے حصّے) کے متعلق اختلاف رائے ہوگیا تھا۔ بعض لوگوں کی رائے تھی کہ پہلا حصّہ حضورؐ کے خلیفہ کو ملنا چاہیے۔ کچھ لوگوں کی رائے تھی کہ دوسرا حصّہ حضورؐ کے رشتہ داروں کو ملنا چاہیے۔ کچھ اور لوگوں کا خیال تھا کہ دوسرا حصّہ خلیفہ کے رشتہ داروں کو دیا جانا چاہیے۔ آخر کار اس بات پر اجماع ہوگیا کہ یہ دونوں حصّے جہاد کی ضروریات پر صرف کیے جائیں۔ عطاء بن سائب کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے عہد میں حضورؐ کا حصّہ اور

گردش نہ کرتا رہے[14]۔ جو کچھ رسولؐ تمہیں دے وہ لے لو اور جس چیز سے وہ تم کو روک دے اس سے رُک جاؤ۔

رشتہ داروں کا حصّہ بنی ہاشم کو بھیجنا شروع کر دیا تھا۔ امام ابوحنیفہ اور اکثر فقہائے حنفیہ کی رائے یہ ہے کہ اس معاملہ میں وہی عمل صحیح ہے جو خلفائے راشدین کے زمانے میں جاری تھا (کتاب الخراج لابی یوسف، صفحہ ۱۹ تا ۲۱)۔ امام شافعیؒ کی رائے یہ ہے کہ جن لوگوں کا ہاشمی و مُطّلبی ہونا ثابت ہو یا عام طور پر معلوم و معروف ہو ان کے غنی و فقیر، دونوں طرح کے اشخاص کو فَے میں سے مال دیا جا سکتا ہے (مُغنی المحتاج)۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ صرف ان کے محتاج لوگوں کی اس مال سے مدد کی جا سکتی ہے، البتہ ان کا حق دوسروں پر فائق ہے (روح المعانی)۔ امام مالک کے نزدیک اس معاملہ میں حکومت پر کوئی پابندی نہیں ہے، جس مد میں جس طرح مناسب سمجھے صرف کرے، مگر اَولیٰ یہ ہے کہ آلِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مقدم رکھے (حاشیۃ الدُّسُوقی علی الشرح الکبیر)۔

باقی تین حصّوں کے بارے میں فقہاء کے درمیان کوئی بحث نہیں ہے۔ البتہ امام شافعی اور ائمہ ثلاثہ کے درمیان اختلاف یہ ہے کہ امام شافعی کے نزدیک فَے کے جملہ اموال کو پانچ برابر کے حصّوں میں تقسیم کر کے ان میں سے ایک حصّہ مذکورۂ بالا مصارف پر اس طرح صرف کیا جانا چاہیے کہ اس کا ۱/۵ مصالح مسلمین پر، ۱/۵ بنی ہاشم و بنی المطّلب پر، ۱/۵ یتامیٰ پر، ۱/۵ مساکین پر اور ۱/۵ مسافروں پر صرف کیا جائے۔ بخلاف اِس کے امام مالک، امام ابوحنیفہ اور امام احمد اس تقسیم کے قائل نہیں ہیں، اور ان کی رائے یہ ہے کہ فَے کا پورا مال مصالح مسلمین کے لیے ہے (مغنی المحتاج)

[14] یہ قرآن مجید کی اہم ترین اصولی آیات میں سے ہے جس میں اسلامی معاشرے اور حکومت کی معاشی پالیسی کا یہ بنیادی قاعدہ بیان کیا گیا ہے کہ دولت کی گردش پورے معاشرے میں عام ہونی چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ مال صرف مالداروں ہی میں گھومتا رہے، یا امیر روز بروز امیر تر اور غریب روز بروز غریب تر ہوتے چلے جائیں۔ قرآن مجید میں اس پالیسی کو صرف بیان ہی کرنے پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے بلکہ اسی مقصد کے لیے سُود حرام کیا گیا ہے، زکوٰۃ فرض کی گئی ہے، اموالِ غنیمت میں سے خُمس نکالنے کا حکم دیا گیا ہے، صدقاتِ نافلہ کی جگہ جگہ تلقین کی گئی ہے، مختلف قسم کے کفّاروں کی ایسی صورتیں تجویز کی گئی ہیں جن سے دولت کے بہاؤ کا رُخ معاشرے کے غریب طبقات کی طرف پھیر دیا جائے، میراث کا ایسا قانون بنایا گیا ہے کہ ہر مرنے والے کی چھوڑی ہوئی دولت زیادہ سے زیادہ وسیع دائرے میں پھیل جائے، اخلاقی حیثیت سے بُخل کو سخت قابلِ مذمّت اور فیّاضی کو بہترین صفت قرار دیا گیا ہے، خوشحال طبقوں کو یہ سمجھایا گیا ہے کہ ان

اللہ سے ڈرو، اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔[۱۵] نیز وہ مال، اُن غریب مہاجرین کے لیے ہے جو اپنے گھروں

کے مال میں سائل اور محروم کا حق ہے جسے خیرات نہیں بلکہ ان کا حق سمجھ کر ہی انہیں ادا کرنا چاہیے۔ اور اسلامی حکومت کی آمدنی کے ایک بہت بڑے ذریعہ، یعنی فَے کے متعلق یہ قانون مقرر کر دیا گیا ہے کہ اس کا ایک حصہ لازماً معاشرے کے غریب طبقات کو سہارا دینے کے لیے صرف کیا جائے۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی نگاہ میں رہنی چاہیے کہ اسلامی حکومت کے ذرائع آمدنی کی اہم ترین مدات دو ہیں۔ ایک زکوٰۃ، دوسری فَے۔ زکوٰۃ مسلمانوں کے پورے زائد از نصاب سرمائے، مواشی، اموالِ تجارت اور زرعی پیداوار سے وصول کی جاتی ہے اور وہ زیادہ تر غریبوں ہی کے لیے مخصوص ہے۔ اور فَے میں جزیہ و خراج سمیت وہ تمام آمدنیاں شامل ہیں جو غیر مسلموں سے حاصل ہوں، اور ان کا بھی بڑا حصہ غریبوں ہی کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔ یہ کھلا ہوا اشارہ اس طرف ہے کہ ایک اسلامی حکومت کو اپنی آمد و خرچ کا نظام، اور بحیثیتِ مجموعی ملک کے تمام مالی اور معاشی معاملات کا انتظام اس طرح کرنا چاہیے کہ دولت کے ذرائع پر مالدار اور بااثر لوگوں کی اجارہ داری قائم نہ ہو، اور دولت کا بہاؤ نہ غریبوں سے امیروں کی طرف ہونے پائے نہ وہ امیروں ہی میں چکر لگاتی رہے۔

[۱۵] سلسلۂ بیان کے لحاظ سے اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اموالِ بنی نضیر کے انتظام، اور اسی طرح بعد کے اموالِ فَے کی تقسیم کے معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو فیصلہ فرمائیں اسے بے چون و چرا تسلیم کر لو، جو کچھ حضورؐ کسی کو دیں وہ اسے لے لے، اور جو کسی کو نہ دیں وہ اس پر کوئی احتجاج یا مطالبہ نہ کرے۔ لیکن چونکہ حکم کے الفاظ عام ہیں، اس لیے یہ صرف اموالِ فَے کی تقسیم تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس کا منشا یہ ہے کہ تمام معاملات میں مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کریں۔ اس منشا کو یہ بات اور زیادہ واضح کر دیتی ہے کہ "جو کچھ رسول تمہیں دے" کے مقابلہ میں "جو کچھ نہ دے" کے الفاظ استعمال نہیں فرمائے گئے ہیں، بلکہ فرمایا یہ گیا ہے کہ "جس چیز سے وہ تمہیں روک دے (یا منع کر دے) اس سے رک جاؤ"۔ اگر حکم کا مقصود صرف اموالِ فَے کی تقسیم کے معاملہ تک اطاعت کو محدود کرنا ہوتا تو "جو کچھ دے" کے مقابلہ میں "جو کچھ نہ دے" فرمایا جاتا۔ منع کرنے یا روک دینے کے الفاظ اس موقع پر لانا خود یہ ظاہر کر دیتا ہے کہ حکم کا مقصود حضورؐ کے امر و نہی کی اطاعت ہے۔ یہی بات ہے جو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ارشاد فرمائی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا اذا امرتکم بامر فأتوا منہ ما استطعتم وما نھیتکم عنہ فاجتنبوہ

اور جائدادوں سے نکال باہر کیے گئے ہیں[۱۶]۔ یہ لوگ اللہ کا فضل اور اس کی خوشنودی چاہتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی حمایت پر کمربستہ رہتے ہیں۔ یہی راستباز لوگ ہیں۔

"جب میں تمہیں کسی بات کا حکم دوں تو جہاں تک ممکن ہو اس پر عمل کرو۔ اور جس بات سے روک دوں اس سے اجتناب کرو" (بخاری، مسلم)۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے متعلق روایت ہے کہ ایک دفعہ انہوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا "اللہ تعالیٰ نے فلاں فلاں فیشن کرنے والی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے"۔ اس تقریر کو سن کر ایک عورت ان کے پاس آئی اور اس نے عرض کیا یہ بات آپ نے کہاں سے اخذ کی ہے؟ کتاب اللہ میں تو یہ مضمون کہیں میری نظر سے نہیں گزرا۔ حضرت عبداللہ نے فرمایا تو نے اگر اللہ کی کتاب پڑھی ہوتی تو یہ بات ضرور تجھے اس میں مل جاتی۔ کیا تو نے یہ آیت نہیں پڑھی کہ مَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا؟ اس نے عرض کیا، ہاں، یہ آیت تو میں نے پڑھی ہے۔ حضرت عبداللہ نے فرمایا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فعل سے منع فرمایا ہے اور یہ خبر دی ہے کہ اللہ نے ایسا فعل کرنے والی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے۔ عورت نے عرض کیا اب میں سمجھ گئی۔ (بخاری، مسلم، مسند احمد، مسند ابن ابی حاتم)۔

[۱۶] اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اس وقت مکہ معظمہ اور عرب کے دوسرے علاقوں سے صرف اس بنا پر نکال دیئے گئے تھے کہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ بنی النضیر کا علاقہ فتح ہونے سے پہلے تک ان مہاجرین کے لیے گزر بسر کا کوئی مستقل ذریعہ نہ تھا۔ اب حکم دیا گیا کہ یہ مال جو اس وقت ہاتھ آیا ہے، اور آئندہ جو اموال بھی فَے کے طور پر ہاتھ آئیں، ان میں عام مساکین، یتامیٰ اور مسافروں کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کا حق بھی ہے، ان سے ایسے سب لوگوں کو سہارا دیا جانا چاہیے جو اللہ اور اس کے رسول اور اس کے دین کی خاطر ہجرت پر مجبور ہو کر دارالاسلام میں آئیں۔ اس حکم کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی النضیر کی جائدادوں کا ایک حصہ مہاجرین میں تقسیم کر دیا اور وہ نخلستان جو انصار نے اپنے مہاجر بھائیوں کی مدد کے لیے دے رکھے تھے ان کو واپس کر دیئے گئے۔ لیکن یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ فَے میں مہاجرین کا یہ حصہ صرف اسی زمانہ کے لیے تھا۔ درحقیقت اس آیت کا منشا یہ ہے کہ قیامت تک جو لوگ بھی مسلمان ہونے کی وجہ سے جلا وطن ہو کر کسی مسلم مملکت کے حدود میں پناہ لینے پر مجبور ہوں، ان کو بسانا اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل بنانا اس ملک کی اسلامی حکومت کے فرائض میں شامل ہے، اور اسے زکوٰۃ کے علاوہ اموالِ فَے میں سے بھی اس مد پر خرچ کرنا چاہیے۔

شیخ امجد الزّھاویؒ

خلیل حامدی

بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے یہ حدیث مروی ہے کہ: ان اللہ لا یقبض العلم انتزاعاً ینتزعہ من العباد ولکن یقبض العلم بقبض العلماء حتیٰ اذا لم یبق عالماً اتخذ الناس رؤوساً جہالاً فافتوا بغیر علم فضلوا واضلوا (اللہ تعالیٰ علم کو یوں نہیں واپس لے لیگا کہ بندوں کے سینوں سے اُسے نکال لے گا بلکہ اہلِ علم کو اپنے پاس واپس بلائے گا۔ یہاں تک کہ جب ایک عالم بھی نہ چھوڑے گا تو لوگ جاہلوں کو اپنا پیشوا بنائیں گے اور وہ علم کے بغیر ہی فتوے صادر کریں گے اور خود بھی گمراہ ہوں گے اور خلقِ خدا کو بھی گمراہ کریں گے)۔ اس حدیث کی صداقت اِس دَور میں صاف محسوس کی جا سکتی ہے۔ علمائے حق اور دین و ملّت کے مخلص خادم ایک ایک کر کے رخصت ہوتے جا رہے ہیں اور عقابوں کے نشیمن زاغوں کے تصرّف میں آ رہے ہیں۔ یوں تو اسلامی تاریخ کے ہر دَور میں دنیا کے پرستار اور سیم و زر کی پوجا کرنے والے "علماء" کی مثالیں ملتی ہیں مگر خال خال لیکن بیسویں صدی عیسوی کا یہ نصف ثانی جس سے آج ہم گزر رہے ہیں، اِس افسوس ناک ــ بلکہ حیرت ناک ــ صورتِ حال سے دوچار ہے کہ پچھلی صدیوں میں علمائے سُو کی جو خال خال مثالیں ملتی تھیں اب اس کے برعکس علمائے حق گوہرِ نایاب ہوتے جا رہے ہیں۔ اور یوں نظر آ رہا ہے جیسے تیرہ و تار دشت کے اندر جستہ جستہ چند قندیلیں ٹمٹما رہی ہوں۔ اور جب کبھی کسی قندیل کے بجھ جانے کی خبر ملتی ہے تو تاریکی کے فزوں ہو جانے کا احساس شدید ہونے لگتا ہے۔ اور کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ کسی قندیل کے فرو ہو جانے کے بعد اُسی آب و تاب کے ساتھ کوئی اور قندیل فروزاں ہو گئی ہو۔

پورے عالمِ اسلامی پر نظر ڈالیں۔ صرف رُبع صدی قبل بلبشۂ علم و فقہ کے اندر جو مردانِ حُر نظر آتے تھے اور تحقیق و نظر کے جن شہسواروں کا غلغلہ تھا کیا گنتی کی چند مثالوں سے قطعِ نظر اُن کے پیدا کردہ خلا کو کم سے کم

تناسب کے ساتھ بھی پُر کیا جا سکا ہے؟ ۔ درحقیقت مسلمان ملکوں میں ماضی قریب کا دور ایسی "مسموم" فضا میں گھرا رہا ہے ۔ اور گھرا ہوا ہے ـــــ جس نے پوری ملت کو بانجھ پن کی بیماری لگا دی ہے ۔ اور علم و فقہ ہی پر کیا موقوف ہے سیاست و قیادت کے ذوقِ سلیم کو بھی مکدر کر دیا ہے ۔ الجزائر سے بشیر ابراہیمی رخصت ہوئے گویا علم و ادب اور جہاد و دعوت کی بساط لپیٹ گئی ۔ شام کے مصطفیٰ سباعی کی موت سے شام کے علمی و تحریکی افق دھندلا گئے ۔ ترکان احرار بدیع الزمان نورسی کا نعم البدل نہ پا سکے ۔ اور اب عراق کی پُرخروش سرزمین ایک ایسی عظیم اور فقید المثال شخصیت سے تہی دامن ہو گئی ہے جس کے خسارہ کی تلافی نہ ہو سکے گی ۔ تحریک دعوت و جہاد قلیل دنفے کے اندر دو زبردست جھٹکوں سے دوچار ہوئی ہے ۔ ایک سید قطب کی شہادت (۱۹۶۶ء) اور دوسرے عراق کے شیخ کبیر اور مجاہد جلیل امجد الزہاوی کی رحلت (۱۹۶۷ء) ۔ مسلمان ممالک الحاد و زندقہ اور مادہ پرستی اور فرنگیت کی جس رو میں بہے چلے جا رہے ہیں اس کا تقاضا ہے کہ جری اور مخلص اور خدا پرست علماء کی تعداد میں مزید اضافہ ہو اور یہ طرفہ کارروائی نہ ہوتی رہے مگر ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ ۔ اس کے برخلاف ملتِ اسلامی کی آزمائش کی سنگینی کا یہ عالم ہے کہ جو بقیۃ السّلف اور بقیۃ السّیف رہ گئے تھے وہ بھی مسند خالی کرتے جا رہے ہیں ۔ خدا پاکستان کے علامہ الناسی، مصر کے ابو زہرہ اور حسنین مخلوف، شام کے حسن حبنکہ اور عراق کے محمد محمود الصواف اور علامہ سامی کے دوسرے چند گنے چُنے اصحابِ علم اور قلندرانِ وفا شعار کو عمر دراز عطا فرمائے ۔ انہی جیسے حضرات کے دم قدم سے اب مسندِ دعوت و افتاء اور منصبِ فقہ و ادراک کی کچھ رونق اور آبرو باقی ہے ۔

غالباً سنہ ۱۹۵۸ء کے اواخر کی بات ہے کہ کراچی کے ایک تیسرے درجے کے ہوٹل میں شیخ امجد الزہاوی کو پہلی بار دیکھا ۔ انتہائی ضعیف اور لاغر و نحیف ۔ کسی معاون اور خادم کے بغیر ۔ راقم الحروف نے ان سے تکلیفِ سفر کا مقصد دریافت کیا تو فرمانے لگے : جب سے مجھے پاکستان کے فوجی انقلاب کی اطلاع ملی ہے، ایک آرزو میرے دل میں اُبل رہی ہے ۔ میں نے سنا ہے کہ انقلاب کے سربراہ جناب محمد ایوب خاں کا تعلق افغان نسل سے ہے ۔ افغان قوم کے بارے میں میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اس میں ملی غیرت و حمیت اور جوشِ جہاد بہت ہوتا ہے ۔ شیخ مرحوم نے اس سلسلے میں افغان قوم کی دینی عصبیت اور جذبے کی چند مثالیں بھی پیش کیں ۔ اور اس کے بعد نہایت پُرامید

اور تمتماتے ہوئے چہرے کے ساتھ فرمایا: مجھے محمد ایوب خاں سے امید واثق ہے کہ وہ افغان ثابت ہوں گے، اور اِس ملک کے اندر اسلام کا بول بالا کریں گے اور جہاد کی طرح ڈالیں گے۔ دریں اثنا مرحوم بار بار جمال الدین افغانیؒ اور شیخ سعید شامل کی مثالیں پیش کرتے رہے۔ انہوں نے یہ بھی حکمت کی بات فرمائی کہ دعوت و اصلاح کا کام بے شبہ عوامی پیمانے پر جاری رہنا چاہیے۔ مگر ضرورت اِس بات کی ہے کہ حکمرانوں تک دعوت پہنچائی جائے اور ان کی اصلاح کی صورت نکالی جائے۔ کیونکہ اگر حاکم راہِ راست اختیار کرلے تو اُس کے بعد عوام کی اصلاح بہت آسان ہو جاتی ہے۔ اور اگر حکام بگڑے رہیں تو کسی اصلاحی انقلاب کا برپا ہونا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے اپنے تجربات کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے اپنا مشہور جملہ دُہرایا: ہم بڑے پاپڑ بیل کر مشکل ایک فرد کی اصلاح کر پاتے ہیں اور بے خدا حکومت کا ادارہ روزانہ ہزارہا افراد کو بگاڑ کر رکھ دیتا ہے۔ اِسی حکیمانہ اصُول کے تحت شیخ امجد الزھاوی نے ۸۰ سال کی عمر میں بغداد سے کراچی کا سفر کیا۔ اور کئی ماہ تک وہ جناب محمد ایوب خاں کی ملاقات کے انتظار میں رہے۔ غالباً اِس غرض کے لیے انہوں نے پنڈی کا بھی سفر کیا۔

مرحوم سے دوبارہ ۱۹۶۵ء میں حج کے ایّام میں رابطۂ عالم اسلامی کے دفتر کے اندر مکۃ مکرمہ میں شرفِ زیارت نصیب ہوا۔ ضعف و نقاہت کی شدت کا یہ حال تھا کہ دو آدمیوں کا سہارا لے کر چل سکتے تھے۔ جسمانی قوت بالکل جواب دے چکی تھی۔ مگر قلبی و روحانی طاقت اور جذبہ و ولولہ کی تازگی اِس درجہ تھی کہ بغداد سے مکہ معظمہ کا سفر اور وہ بھی ایّامِ حج کے اندر جب کہ اژدحام کی وجہ سے جوانوں کا زہرہ آب ہو جاتا ہے، صرف اِس بنا پر کیا کہ رابطۂ عالمِ اسلامی کے زیرِ اہتمام دنیا بھر کے علماء اور دینی و علمی رہنماؤں کی کانفرنس منعقد ہو رہی تھی اور اُس میں اسلام کے فروغ اور مسلمانوں کے مسائل اور مشکلات کے حل پر غور و فکر ہونے والا تھا۔ شیخ کی تمام زندگی، عالمِ شباب کی توانائی بھی اور عہدِ پیری کی پختہ کاری بھی، اِسی مقصد پر صرف ہوئی ہے۔ ایسے عظیم اجتماع کو جس میں پانصد کے قریب اسلامی نمائندے شریک ہو رہے تھے شیخ کے لیے نظر انداز کر دینا محال تھا۔ چنانچہ کانفرنس کے اکثر و بیشتر پروگراموں میں انہوں نے حصّہ لیا۔ اور اپنے مفید مشوروں اور بیش قیمت نصائح و تجربات پیش کیے۔

شیخ امجد الزھاوی سن ۱۳۰۰ھ (سنہ ۱۸۸۲ء) میں بغداد میں پیدا ہوئے۔ آپ کا گھرانہ خاندانی وجاہت،

علم وفضل اور قضاء و افتاء میں نامور تھا۔ آپ کے والد شیخ محمد سعید بن محمد فیضی الزہاوی بغداد کے مفتی تھے۔ عثمانی خلافت کے زمانے میں مفتی کا منصب بہت بڑے شرف و اعتلاء کا منصب سمجھا جاتا تھا۔ شیخ امجد الزہاویؒ نے علم و زہد کا اکتساب اپنے والد بزرگوار سے کیا۔ اللہ تعالیٰ نے طفولیت کے اندر ہی طلب و تحقیق کا جو ذوقِ فراواں ارزانی فرمایا تھا اُس کی بدولت مرحوم بغداد کی تمام علمی مجلسوں اور مدرسوں سے استفادہ کرتے رہے۔ نامور علماء و فقہاء کے حلقوں سے منسوب رہے۔ اِس طرح آپ نے بہت بڑا فقہی سرمایہ اپنے سینہ میں سمیٹ لیا۔ مرحوم بڑے زُود فہم، روشن فکر، صائب النظر اور مضبوط حافظہ کے مالک تھے۔ جن مشہور علماء سے کسبِ علم کیا اُن میں سے ایک فقیہ بغداد شیخ عباس القصاب تھے اور دوسرے مولانا غلام رسول ہندی۔ بغداد کے علمی چشموں سے سیراب ہونے کے بعد آستانہ (استنبول) کا سفر کیا اور وہاں کے کلیۃ القضاء (قضاۃ کے کالج) میں داخل ہو گئے۔

۱۹۰۶ء میں اس کالج سے نہایت امتیاز کے ساتھ فارغ ہوتے۔ اور جب بغداد واپس ہوئے تو حکومت کی طرف سے انہیں اَحساء میں مفتی مقرر کر دیا گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد بغداد منتقل کر دیئے گئے اور بغداد کے کورٹ آف اپیل کے جج بنا دیئے گئے۔ موصوف کی قانونی بصیرت، حیرت انگیز قوتِ حافظہ اور اخلاصِ عمل سے ہر شخص متاثر تھا۔ کچھ مدت کے بعد انہیں بصرہ کی فوجداری عدالت کا چیف جج اور پھر موصل کی دیوانی عدالت کا چیف جج بنایا گیا۔

۱۹۲۱ء میں عراق کے اندر سیاسی طور پر بڑی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ خلافتِ عثمانی کے بجائے انگریزوں کی مسندِ اقتدار بچھ گئی۔ اور ایک مقامی حکومت کی تشکیل ہوئی۔ شیخ امجد الزہاوی نے نئے حالات کی بنا پر ملازمت سے استعفاء دے دیا اور وکالت شروع کر دی۔ ان کی ذاتی خوبیوں اور خاندانی شہرت نے نئی حکومت کو بھی آپ کی قدر دانی پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ آپ کو وزارتِ اوقاف کا مشیر بنا دیا گیا۔ مگر علم و دعوت کا شوق زیادہ دیر تک اس منصب کو گوارا نہ کر سکا۔ اِسے ترک کر دیا اور تعلیم و تدریس کو شیوہ بنا لیا اور بغداد کے لا کالج میں مجلۂ احکامِ شرعیہ کے اُستاذ مقرر ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پُورے عراق میں اسلامی قانون کا آپ سے بڑا عالم کوئی نہ تھا۔ چنانچہ حکومت کی طرف سے آپ کو عراق کے قاضی القضاۃ کا عظیم ترین منصب سونپا گیا اور ۱۹۴۷ء تک مرحوم اس منصب پر فائز رہے۔ آپ نے حق گوئی اور جرأت اور علمی بصیرت اور عدل گستری کی نادر مثالیں

پیش کیں، اور حق کے معاملے میں کسی کی ملامت اور تخویف کی پروا نہیں کی۔ قضا کی مشغولیت کے ساتھ ساتھ آپ نے تدریس و تربیت کا کام بھی جاری رکھا۔ بغداد کے مدرسہ سلیمانیہ میں باقاعدہ علوم شرعیہ کی تعلیم دیتے رہے۔ آپ کے والد بھی اسی مدرسہ میں پڑھا چکے تھے۔

شیخ امجد الزہاوی محض عالمِ دین، ماہرِ قانون اور حق گو انسان ہی نہ تھے بلکہ انہوں نے عراق میں اسلامی دعوت و تحریک کی بنیاد ڈالی۔ اپنے حلقۂ تدریس و تعلیم اور شغلِ فقہ و قضا کو اس تحریک کا نرسری فارم بنایا۔ ان کے تلامذہ کی جماعت دلوں میں دعوت و اصلاح، جہاد و عمل اور اقامتِ دین کا جذبہ لے کر نکلی۔ آج ہمیں عراق میں حکومت کے تشدد کے باوجود اسلام کے نام لیواؤں کی جو سخت جان اور نڈر جماعت نظر آ رہی ہے وہ شیخ امجد الزہاوی کی کوششوں کا ثمرہ ہے۔ شیخ نے محض اقامتِ دین کا احساس بیدار کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اقامتِ دین کی تحریک کی باقاعدہ تنظیم کی، اور عراق کے متلون حالات کے اندر مختلف اسالیب اور گوناگوں وسائل سے کاروانِ تحریک کو پا بہ سفر رکھا۔ عراق میں ۱۹۴۷ء میں پہلی مرتبہ جمعیت سازی کا حق بحال ہوا۔ اس بحالی کے بعد سب سے پہلی جو اسلامی تنظیم وجود میں آئی وہ جمعیۃ الآداب الاسلامیہ ہے۔ مرحوم اس جمعیت کے صدر منتخب ہوتے اور جب تک یہ جمعیت قائم رہی اس کے صدر منتخب ہوتے رہے۔ اس کے دو سال بعد ۱۹۴۹ء میں جمعیۃ التربیۃ الاسلامیہ کے نام سے ایک اور جماعت کی داغ بیل ڈالی گئی۔ ان دونوں جماعتوں کے حلقہ ہائے اثر الگ الگ تھے مگر دونوں کا مقصد نوجوان نسل کو اسلامی نظامِ زندگی سے روشناس کرانا تھا۔ مرحوم امجد الزہاوی دوسری جماعت کے صدر بھی منتخب ہوئے اور تادمِ آخر اس کے صدر رہے۔ اور ان دونوں جماعتوں کی مثال درخت کی ہو گئی جس کا تنا ایک تھا اور شاخیں دو الگ سمتوں میں سایہ انداز ہو رہی تھیں۔

اسی دور میں عراق میں مصر کی تحریک اسلامی کی صدائے بازگشت بھی سنائی دے رہی تھی۔ عراق کے جو نوجوان قاہرہ کی ازہر یونیورسٹی اور دوسری یونیورسٹیوں سے فارغ ہو کر آ رہے تھے ان میں ایک تعداد ایسی تھی جو اخوان المسلمون کی دعوت سے متاثر تھی۔ عراق کے نامور اسلامی رہنما شیخ محمد محمود الصواف بھی قاہرہ میں قیام کے دوران حسن البنا اور ان کی دعوت سے متاثر ہوئے تھے۔ شیخ امجد الزہاوی کے لیے اخوان کی دعوت و تحریک کوئی اَن جانی چیز نہ تھی بلکہ ان کی آنکھوں کے سامنے اس شجرِ طیب کی کاشت ہوئی تھی۔ مرحوم حسن البنا

سے شیخ امجد الزھاوی کے ذاتی مراسم تھے۔ اور عراق ہی کیا، اخوان کی دعوت شام، فلسطین، اردن، لبنان، سوڈان اور شمالی افریقہ کے ممالک تک کمندیں ڈال چکی تھی۔ عراق میں اخوان المسلمون کے نام سے کسی تنظیم کا قیام مقامی سیاست کی وجہ سے ناممکن تھا۔ چنانچہ اخوان کی دعوت کی روح و غایت کو شیخ امجد الزھاوی اور شیخ محمد محمود الصواف نے جمعیۃ الاخوۃ الاسلامیہ کے لباس میں اہلِ عراق سے روشناس کرایا۔ جمعیۃ الاخوۃ الاسلامیہ ۱۹۵۱ء میں تشکیل کی گئی۔ شیخ امجد الزھاوی اس کے صدر منتخب ہوئے اور اُس وقت تک قرعۂ صدارت ان کے نام نکلتا رہا جب تک یہ جمعیت قائم رہی۔ الاخوۃ الاسلامیہ کے نام سے اس جمعیت کا ایک ہفت روزہ بھی جاری کیا گیا جس کی ادارت کے فرائض خطیبِ عرب شیخ صواف کو سونپے گئے۔ ہمارے علم کی حد تک عراق کا یہ پہلا اسلامی اخبار ہے جس نے عالمِ وجود میں قدم رکھتے ہی الحاد و استبداد کے قلعوں میں ہلچل مچا دی۔ جبر و تشدد کی ننگی تلوار کے نیچے الاخوۃ الاسلامیہ کی اذانِ حق نے وہی سماں پیدا کر دیا جو مصر میں محب الدین الخطیب کے ہفت روزہ الفتح نے پیدا کیا تھا۔ شیخ امجد الزھاوی کی سرپرستی اور قیادت میں جمعیۃ الاخوۃ الاسلامیہ نے چند سالوں کے اندر عراق کی اسلامی تحریک کی جڑیں مضبوط کر دیں، نوری سعید کی حکومت نے اگرچہ اُس پر پے در پے وار کیے، اور پھر عبدالکریم قاسم کی فوجی آمریت نے بھی اس کا قلع قمع کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، مگر یہ تحریک اس قدر مستحکم ہو چکی ہے کہ اس کا مٹا دینا آسان نہیں ہے۔

ملت اسلامی کے پیچیدہ اور نازک مسائل میں سے ایک مسئلہ علمائے دین کا اختلاف ہے۔ یہ اختلاف اگر اصولی اور بنیادی بحثوں تک ہو اور علمی حدود اور جدلی آداب کے اندر رہے تو کبھی پیچیدہ صورتِ حال پیدا نہیں کر سکتا۔ خرابی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب معاملہ دنیا پرست اور کم نظر علماء کے ہاتھ میں آجائے اور وہ اختلافی آراء کو افہام و تفہیم کے انداز میں پیش کرنے کے بجائے فری اسٹائل کشتی کے رنگ میں پیش کریں۔ عراق میں علماء کو اس غلط راستے سے محفوظ رکھنے کے لیے شیخ امجد الزھاوی نے قابلِ قدر مساعی سرانجام دی ہیں۔ مرحوم خود بہت بڑے فقیہ تھے، اخلاص اور بے غرضی کے پیکر تھے۔ اس لیے انہوں نے کبھی علماء کے اندر تلخی نہیں پیدا ہونے دی۔ مرحوم خود حنفی المسلک تھے مگر وہ عراق کے شافعیوں، حنفیوں اور قلیل التعداد حنبلیوں کے لیے نقطۂ اتصال بنے ہوئے تھے۔ ۱۹۵۳ء میں مرحوم کی مساعی سے علمائے عراق کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کے لیے رابطۃ العلماء

کے نام سے خطباء، علماء اور تمام دینی حلقوں کی ایک متحدہ تنظیم قائم کی گئی۔ یہ تنظیم علمائے عراق کی واحد نمائندہ تنظیم ہے۔ اس کا دائرۂ کار اگرچہ اہلِ سنّت علماء تک محدود ہے مگر شیعہ علماء کا بھی اسے تعاون حاصل ہے۔ مرحوم امجد الزہاوی اس کے صدر منتخب ہوئے اور آخر دم تک اُس کے صدر رہے۔ مرحوم کا سفرِ آخرت رابطۃ العلماء کے صدر کی حیثیت سے ہُوا ہے۔ اس تنظیم نے عراق کے مذہبی حلقوں کو افتراق و تشتّت سے بچا لیا اور انہیں دین کے فرضِ اصلی کی جانب متوجہ کیا۔ راقم الحروف کو ۱۹۶۵ء میں کویت کے اندر اور ۱۹۶۶ء میں مکّہ معظمہ میں ایامِ حج میں رابطۃ العلماء سے وابستہ اہلِ علم سے ملنے اور تبادلۂ خیال کرنے کا موقع ملا ہے۔ انہیں بڑا وسیع القلب، صائب النظر، شیریں زبان، خوش اخلاق اور دوسروں کی بدگوئی سے پاک پایا ہے۔ اختلافی مسائل اور فروعی امور میں بحث کرنے کے لیے انہیں آمادہ نہیں پایا۔ ان سب میں یہ احساس مشترک ہے کہ اشتراکیت، بعثیت، الحاد اور مغربیت کی یلغار سے ملّتِ محمدی کو بچانے کی فکر کرنی چاہیے۔ ان فتنوں کو جب غلبہ حاصل ہو جاتا ہے تو یہ اس امر کا کوئی لحاظ نہیں کرتے کہ کسی فقہی مسلک اور فروعی مسئلے میں کس کی کیا رائے ہے؟ ان کی اندھی تلوار حنفی و شافعی اور سُنّی و شیعہ سب کی گردنوں کو یکساں ناپتی چلی جاتی ہے۔ ترکی کی مثال سب کے سامنے ہے۔ مرحوم امجد الزہاوی کا لگایا ہُوا یہ پاکیزہ پَودا ابھی تک قائم ہے اور خدا کرے مزید ہرا بھرا ہو۔

مرحوم کے متوسّلین ان کی تین خوبیوں کا خاص طور پر ذکر کرتے ہیں۔ ایک ان کا اخلاص و للّٰہیت، دوسرے خشیتِ الٰہی اور تیسرے احوالِ مسلمین سے غیر معمولی شغف۔ احوالِ مسلمین سے ان کو اس درجہ شغف و اہتمام تھا کہ وہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے حالات معلوم کرنے کے لیے بڑے فکرمند رہتے۔ اپنے تمام شاگردوں اور ساتھیوں کو ان کی عام نصیحت یہ ہوتی تھی کہ "مسلمانوں کو بچانے کے لیے فوری بھاگ دوڑ کیجیے۔ وفات سے ایک گھنٹہ قبل وہ اپنے ایک رفیق سے مسلمانوں کی حالتِ زار کا شکوہ کرتے رہے۔ ۱۹۴۸ء میں جب پہلی مرتبہ عربوں اور اسرائیل کے درمیان جنگ چھڑی تو ۷۰ سال کا بُڈھا امجد الزہاوی بھی مجاہدینِ فلسطین کے ساتھ مورچوں میں موجود تھا، اور مجاہدین کے اندر جہاد کی رُوح پھونک رہا تھا۔ امجد الزہاوی نے عراق میں جمعیتِ انقاذِ فلسطین فلسطین کی واگزاری کی جمعیت قائم کی اور رضا کار بھرتی کر کے میدانِ قتال کی طرف بھیجنے شروع کر دیئے۔ اور ساتھ ساتھ مجاہدین اور مہاجرینِ فلسطین کے لیے مالی اعانتیں بھی فراہم کیں۔ ۱۹۵۵ء میں شیخ الزہاوی نے مسئلہ

فلسطین سے مسلمان اقوام کو بہ تفصیل آگاہ کرنے کے لیے مختلف اسلامی ملکوں کا طویل دورہ کیا۔ اس دورہ میں وہ پاکستان، ہندوستان، انڈونیشیا اور جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں میں گئے اور سات ماہ تک مسلسل ان میں پھرتے رہے۔ وہاں کے حکام اور ذمہ دار حلقوں سے ملے، ارباب ادب و صحافت کو فلسطین کی کہانی سنائی، دانشوروں اور ملی رہنماؤں کو اس مسئلہ کی حقیقت اور نزاکت سے آگاہ کیا۔ اور اس کے لیے جان و مال اور زبان و قلم سے جہاد کرنے کی اپیل کی۔ عالم پیری کے اندر یہ طویل سفر محض شیخ کی قوتِ ایمانی اور سوزِ دروں کا کرشمہ تھا۔ اسلامی تحریک کے داعی نے مسئلہ فلسطین کے بارے میں جس تعلق و اہتمام کا ثبوت دیا وہ عین تقاضائے اسلام تھا۔ مگر دوسری طرف جب عراق میں اشتراکی انقلاب برپا ہوا اور عبدالکریم قاسم نے زمام اقتدار پر قبضہ کر لیا تو اس نے جمعیت انقاذ فلسطین کو توڑ دیا۔ کیونکہ اس کی اشتراکی سیاست اس مسئلہ کو زندہ رکھنے اور اسے ہوا دینے کی حامی نہ تھی۔ اگرچہ آخری دور میں اس نے اس مسئلہ کو از خود زندہ کرنے بلکہ اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کی، مگر یہ کوشش مسئلہ فلسطین کی خدمت کے لیے نہیں تھی، بلکہ اپنے ایک حریف کو زک دینے کے لیے شطرنج سیاست پر ایک انوکھے مہرے کے طور پر اختیار کی تھی۔

الجزائر کی جنگِ آزادی سے بھی مرحوم امجد الزہاوی وابستہ رہے۔ الجزائر میں جب جنگِ آزادی لڑی جا رہی تھی تو مرحوم نے اس دوران میں الجزائری مجاہدین کو مالی اور اسلحہ کی امداد فراہم کرنے کے لیے عراق میں اعانت الجزائر کمیٹی کی تشکیل کی اور خود اس کے صدر منتخب ہوئے۔ اس کمیٹی نے لاکھوں دینار جمع کیے اور مجاہدین کو ہر نوعیت کا سامان فراہم کیا۔ مسئلہ کشمیر کے معاملہ میں بھی انہوں نے پاکستان کی تائید و حمایت کا ہر موقع پر پورا پورا حق ادا کیا ہے۔ عرب دنیا میں پاکستان کو جو مخلص اور بے لوث حامی نصیب ہوئے ان میں عراق کے یہ مجاہد اعظم بھی تھے۔ شیخ نے اس دور میں مسئلہ کشمیر کے سلسلے میں پاکستان کے حق میں آواز اٹھائی جب عربوں پر عرب قوم پرستی اور بھارت نوازی کا جنون سوار تھا اور نہرو انہیں "پیغمبرِ امن" نظر آتا تھا۔ پاک بھارت جنگ کے بعد جب کاسابلنکا میں عرب سربراہوں کی کانفرنس منعقد ہوئی اور عراق کے سربراہ مرحوم عبدالسلام عارف اس میں شرکت کے لیے روانہ ہوئے تو شیخ امجد الزہاوی علماء کا وفد لے کر عبدالسلام عارف کے پاس گئے اور ان سے اپیل کی کہ وہ اس کانفرنس میں مسئلہ کشمیر کے بارے میں پاکستان کی حمایت کریں۔ علاوہ ازیں شیخ کی طرف سے عرب لیگ اور

دوسرے سربراہوں کو بھی اسی نوعیت کے تار دیئے گئے۔ پاکستان کے صدر کو بھی رابطۃ العلماء کی طرف سے حمایت و تائید کا تار دیا۔ رابطۃ العلماء کے لوگوں نے عراق بھر میں پاکستان کی حمایت میں تقریریں کیں۔ شیخ امجد الزھاوی نے عراق میں پاکستان کے سفیر کی وساطت سے صدر محمد ایوب خاں کے نام ایک مراسلہ بھی ۱۲ ستمبر ۱۹۶۵ء کو دیعنی پاک بھارت جنگ سے صرف چھ روز بعد) بھیجا جس کا متن یہ ہے:

"دنیا بھر کے مسلمانوں کی نظریں پاک بھارت جنگ پر لگی ہوئی ہیں۔ وہ اپنے پاکستانی بھائیوں کے حالات معلوم کرنے کے لیے دنیا بھر کے ریڈیو اسٹیشنوں کو سن رہے ہیں۔ اسلام کا تقاضا بھی یہ ہے کہ ہر مسلمان اپنے مسلمان بھائی کے معاملے میں پوری دلچسپی لے اور اس کی مدد میں کوتاہی نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: انما المومنون اخوۃ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: جو مسلمانوں کے معاملات سے سروکار نہیں رکھتا وہ ہم میں سے نہیں ہے"۔ برادرم ہم آپ کی مدد و نصرت کی اس کے سوا کوئی سبیل نہیں پاسکے کہ آپ کے سامنے وہ چیز پیش کریں جس میں اہل ایمان کا نفع ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی حالت صرف اُس طریقہ سے درست ہو سکے گی جس طریقہ سے ماضی میں ان کی حالت درست ہوئی تھی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کے گروہِ قلیل کو بھی کافروں کے گروہِ کثیر پر غالب کر دیتا ہے۔ پس مومن اگر حبل اللہ کو تھامے ہوئے ہے تو اُسے کوئی چیز شکست نہیں دے سکتی۔ پاکستان کی مسلمان قوم اس وقت ایک امتحان میں ہے۔ اور اس امتحان سے اُسے صرف اُس وقت نجات مل سکتی ہے جب اس کے حکمران کتاب اللہ اور سنتِ رسولؐ اللہ کو مضبوطی سے تھام لیں گے۔ اللہ کا ارشاد ہے: ان تنصروا اللہ ینصرکم ویثبت اقدامکم (اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے پاؤں مضبوط کرے گا)۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے: "جب تک تم میرے طریقہ پر چلتے رہو گے تم دشمنوں پر غالب رہو گے۔ اگر تم نے میرا طریقہ چھوڑ دیا تو اللہ تعالیٰ تم پر ان لوگوں کو مسلّط کر دے گا جو تمہیں خوف میں مبتلا کر دیں گے۔ اور جب تک تم میرے طریقہ کی طرف لوٹ نہ آؤ گے ان کا خوف تمہارے دلوں سے نہیں نکالے گا۔ برادرم ہم آپ کو اللہ کی کتاب، اس کے رسول کی سُنّت اور رجوع الی اللہ کی دعوت دیتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ

آپ کو اور ہمارے پاکستان کے مسلمان بھائیوں کے لیے راہِ نجات مہیا کرے۔ ومن یتق اللّٰہ یجعل له مخرجاً ویرزقه من حیث لایحتسب (جو اللہ سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ اُس کے لیے راہِ نجات پیدا کر دیتا ہے اور اُسے وہاں سے روزی پہنچاتا ہے جو اُس کے گمان میں بھی نہیں ہوتا)۔ اور تاکہ اللہ آپ کی مدد کرے اور آپ کو اور اہلِ ایمان کو خصوصی نصرت سے نوازے اور ملک کے اندر سربلند کرے۔ وَکَانَ حَقّاً علینا نصر المومنین ؎

پاکستان کی اسلامی تحریک سے شیخ امجد الزہاوی کو بڑی گہری وابستگی تھی۔ مرحوم نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی گرفتاریوں پر ہمیشہ شدید صدائے احتجاج بلند کی۔ مولانا کی عربی تصنیفات کی ہر موقع پر خود بھی تعریف کی اور اپنے رفقاء اور تلامذہ کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیا۔ جب کبھی اسلامی تحریک پر کوئی اُفتاد پڑی انہوں نے رنج و غم کا اظہار کیا۔ ۱۹۶۴ء میں جب جماعتِ اسلامی کو توڑا گیا اور جماعت کے رہنماؤں کو گرفتار کیا گیا اُس وقت امجد الزہاوی نے صدرِ پاکستان اور دوسرے لوگوں کے نام احتجاجی مراسلے بھیجے۔ مولانا محترم کے ساتھ آخر وقت تک اُن کی مراسلت جاری رہی۔ اُن کا آخری خط جو اگست ۱۹۶۷ء کے اواخر میں مولانا محترم کو وصول ہوا ہے، اُس خط میں وہ لکھتے ہیں:

"مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوتی ہے کہ مسلمانوں کے اندر ایسے رہنما پائے جاتے ہیں جو اسلام اور مسلمانوں کے مسائل کی فکر رکھتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ القدس کے المیہ نے آپ لوگوں کے دلوں پر بڑا اثر کیا ہے اور جہاد فی سبیل اللہ کے جذبات برانگیختہ کر دیئے ہیں۔ یہی جذبات انشاء اللہ مسلمانوں کی قوت اور بیداری کا باعث بنیں گے، بشرطیکہ مسلمان باہمی تعاون کے راستہ پر چلتے رہے اور بر و تقویٰ میں ایک دوسرے کی پشت پناہی کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مساعی کو قبول فرمائے۔ اسلامی اخوت کی اشاعت اور اسلامی روابط کو فروغ دینے کے لیے آپ جو جدوجہد کر رہے ہیں اُس میں برکت دے۔ اسلام کے فروغ میں اعلاد کا کام لامثال ہے۔ عہدِ حاضر میں جو شخص اسلام کی دعوت کا کام کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو اجر اُسے ملے گا اور جو سعادت اُسے نصیب ہو گی اُس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ دور غالباً وہی دور ہے جس کے بارے میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا ہے : سیاتی زمن یکون اجر العامل فیہ اجر سبعین رجلا قالوا منہم یارسول اللہ قال بل منکم "(ایک ایسا دور بھی آئے گا جس میں اسلام کے ایک خادم کا اجر ستر آدمیوں کے اجر کے برابر ہوگا۔ صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ اُس دور کے ستر آدمیوں کے برابر؟ آپ نے فرمایا: تمہاری جماعت کے ستر آدمیوں کے اجر کے برابر)۔ آج جو شخص اسلام کا پرچار کرتا ہے وہ درحقیقت نوعِ بشری کی بہبودی اور سعادت کا کام کرتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس کام کی اُجرت اور معاوضے کی کوئی حد مقرر نہیں کی جاسکتی۔ آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی عمر دراز کرے اور آپ کی کوششوں کو قائم و دائم رکھے اور کامیابی سے نوازے۔"

مرحوم امجد الزہاوی کے بارے میں اُن کے ایک رفیق لکھتے ہیں: "مرحوم علم و فضل اور جذبۂ جہاد کے لحاظ سے سلف صالحین کا نمونہ تھے۔ مسلمانوں کے بارے میں فکرمند رہتے تھے۔ مسلمانوں پر جب کوئی آفت ٹوٹ پڑتی تو یہ شدید کرب میں مبتلا ہو جاتے۔ مسلمانوں کی سربلندی اور نجات کے لیے ہردم سوچتے رہتے۔ ہر اسلامی ملک کے بارے میں رفقاء سے پوچھتے رہتے۔ ہر وہ جماعت جو دعوت الی الخیر اور مدافعتِ اسلام کے مشن کو لے کر اٹھتی اُس کے حالات کی ٹوہ میں رہتے اور اُس کے لیے دعائے خیر کرتے رہتے۔ مرحوم رجائی فکر کے حامل تھے۔ ناامیدی اور قنوطیت کبھی اُن کے اندر پیدا نہ ہوتی تھی۔ ان کے سینے میں بڑا مضبوط دل تھا۔ ان کی روح جہاد و حرکت سے سرشار تھی۔ اصلاحی جماعتوں کی تنظیم میں انہوں نے بہت بڑا رول ادا کیا۔ ان کی رائے یہ تھی کہ مسلمان قوم اپنی بگڑی خود سنوار سکتی ہے۔ حکومتوں پر سراسر بھروسہ کرتے رہنا درست نہیں ہے۔ مرحوم بڑے پاک نفس اور متقی تھے۔ ان کا وعظ بڑا پُراثر ہوتا تھا۔ وہ حق کے معاملے میں کسی ملامت اور تہدید سے خائف نہ ہوتے تھے۔ اسلامی مسائل کے معاملے میں وہ بلاجھجک حکام سے جا کر ملتے اور انہیں تذکیر و تبلیغ کرتے۔ جب بیماری کی وجہ سے صاحبِ فراش ہو گئے تو انہوں نے خطوط اور مراسلوں کو ذریعۂ دعوت بنا لیا۔"[1]

ان کے ایک شاگرد ڈاکٹر وجیہ زین العابدین لکھتے ہیں:

"مرحوم کی پوری زندگی جہاد و صبر سے عبارت ہے۔ اللہ کی راہ میں وہ ہمیشہ استقامت اور

[1] مجلۃ التربیۃ الاسلامیہ، بغداد شمارہ دسمبر ۱۹۶۷ء

ثبات دکھاتے رہے تاکہ اللہ کا کلمہ سربلند ہو۔ طواغیت اور اربابِ باطل کے سامنے وہ آہنی چٹان تھے۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ جب کہ ملک سخت تاریک حالات سے گزر رہا تھا ایک خطیب کو گرفتار کر لیا گیا، اور اُسے شدید زدوکوب کیا گیا۔ مرحوم نے فوراً علماء کو جمع کیا اور حکومت کو اس بارے میں ایک احتجاجی یادداشت پیش کی۔ اس طرح انہوں نے اپنے ایک بھائی اور اپنے دین کی مؤثر خدمت انجام دی۔ مرحوم عمر اور بزرگی کے لحاظ سے تو شیخ کہے جا سکتے ہیں، مگر اُن کا دل اور عزم جوان تھا۔ زندگی اور حرارت ان کے اندر اُچھل رہی تھی۔ تا دمِ آخر وہ جہاد کرتے رہے[۱]"

عراق کے ایک اسلام پسند اہلِ علم ڈاکٹر عبدالکریم زیدان لکھتے ہیں:

"شیخ اخلاص کامل، خشیتِ الٰہی اور امورِ مسلمین کی فکرمندی کا صحیح نمونہ تھے۔ ان کا اخلاص اس حد تک صاف و شفاف تھا کہ ان کے اندر جاہ و اقتدار، ستائش پسندی اور شہرت کا ادنیٰ شائبہ تک نہ تھا۔ ان کے اندر خشیتِ الٰہی ہر دیکھنے والی آنکھ صاف محسوس کر لیتی تھی۔ انہوں نے ہمیشہ حدود اللہ کی پاسداری کی، شعائر اللہ کی تعظیم کی، حقوق اللہ کی ادائیگی میں ہمیشہ عجلت سے کام لیا اور سوال و استفسار کے موقع پر حق بات کہنے میں کبھی تامل نہیں کیا، امورِ مسلمین کا انہیں اس درجہ اہتمام تھا کہ جہاں سے اسلامی اجتماع کی خبر انہیں موصول ہو جاتی وہ لپک کر وہاں جاتے، اس غرض کے لیے وہ اکثر اسلامی ملکوں کے اندر پھرتے رہے۔ ان کا نحیف و نزار جسم اور ان کی پیرانہ سالی اس بارے میں کبھی رکاوٹ نہ بن سکی۔ مرحوم جب مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ اور شکستِ حاضر کا تذکرہ کرتے تو زار و قطار روتے۔ اور اُن کی سفید اور نُورانی ریش تر بتر ہو جاتی۔ مجھے سفر و حضر میں، صحت و بیماری میں خصوصی اور عمومی مجلسوں میں ان کی مصاحبت کا شرف حاصل ہوتا رہا ہے۔ میں نے دیکھا کہ ان کے اخلاص، خشیتِ الٰہی اور تعلقِ اسلام میں کبھی ضعف یا کمی واقع نہیں ہوئی۔ بلکہ ان کے اندر ان اوصاف کا ہمیشہ اضافہ ہی ہوتا رہا۔ مرحوم جلیل القدر فقیہ تھے۔ انہوں نے کبھی مداہنت کا راستہ اختیار نہیں کیا، اور دنیا کے عوض دین کو نہیں بیچا۔

---

[۱] روزنامہ الجمہوریہ، بغداد، شمارہ ۲۴ نومبر ۱۹۶۷ء۔

اور اُس وقت بھی کلمہ حق بلند کیا جب دوسرے منقار زیرِ پر ہو گئے رتھے"۔

مرحوم ۷۰ سال کی جہاد و دعوت سے لبریز زندگی بسر کرنے کے بعد آخرِ کار بغداد میں ۱۴ شعبان المعظم ۱۳۸۷ھ مطابق ۱۷ نومبر ۱۹۶۷ء کو جمعۃ المبارک کو عصر کے وقت رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مقبرہ میں دفن ہوئے۔ اللہ تعالیٰ ان پر اور ان کے امام (ابو حنیفہ رحمہ اللہ) پر اپنی رحمت کی بارش کرے۔ مرحوم کا ایک شاگرد اپنے طویل مرثیہ میں کہتا ہے:

بنی الامجاد امجدکم تنائی

وکم من قبلہ طال الغیاب

"اے اربابِ مجد و شرف، تمہارا امجد (ستارۂ عز و شرف) اوجھل ہو گیا۔ اس سے پہلے بھی مجد و شرف سے محرومی کا طویل وقفہ گزرا ہے۔

شراب و قمار

از جناب ریاض الحسن صاحب

اسلام کے سوا دنیا میں جس قدر بھی مذاہب ہیں ان میں سے ہر ایک کی اپنی الہامی کتابیں مشہور ہیں لیکن قرآن مجید کے سوا باقی کتابوں کے متعلق تمام دنیا بلکہ خود ان کے ماننے والوں کا بھی یہ اعتراف ہے کہ وہ اپنی اصلی حالت میں موجود نہیں ہیں۔ مثلاً ہندوؤں کے ویدوں کا تو آج پتہ ملنا بھی مشکل ہے۔ پارسیوں کی گاتھا سکندر اعظم کے شراب کے سرور کی نذر ہو گئی۔ بائیبل کے متعلق رسالہ لائف کا بیان ہے کہ وہ انسانوں کی لکھی ہوئی کتاب ہے۔ اگرچہ اس کے مصنفوں میں یسعیاہ (ISAIH) و حزقی ایل (EZCKIEL) یرمیاہ (JEREMIAH) اور سینٹ پال (ST. PAUL) جیسے مشہور نام ملتے ہیں، لیکن اس کے اکثر الفاظ ان لوگوں کی تصنیف ہیں جن کے نام بھی ہمیں معلوم نہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک ہزار سال بعد تک الہامی پیغام زبانی روایتوں کے ذریعہ باپ سے بیٹے تک منتقل ہوتے رہے۔ جب حضرت عیسیٰ سے کوئی ہزار برس پہلے یہودیوں نے پرانی کہانیوں اور نظموں کو قلمبند کرنا شروع کیا تو بار بار نقل کرنے میں دانستہ اور نادانستہ دونوں طرح سے تبدیلیاں آتی رہیں۔ اور عیسائیت کے پھیلنے کے بعد تو غلطیاں بڑھتی ہی رہیں۔ حتیٰ کہ عہدنامہ جدید میں عہدنامہ قدیم سے بھی زیادہ تبدیلیاں ہوئیں[۱]

نہ صرف عیسائی ان حقائق کو تسلیم کرتے ہیں بلکہ خود بائیبل کے مطالعہ سے بھی یہ باتیں عیاں ہیں اس لیے تفصیل کی چنداں ضرورت نہیں۔ اب اگر کوئی یہ سوال کرے کہ اس جہان کے خالق نے انسانوں کی رہنمائی کے لیے کون کون سے صحائف نازل کیے ہیں تو جوابات مختلف ہو سکتے ہیں، لیکن اگر یہ سوال کیا جائے کہ جن کتابوں

---

[۱] HOW MEN WORSHIP BY F. H. HILLIARD. P 73

[۱] ملاحظہ ہو رسالہ لائف کی اشاعت خاص بعنوان "بائیبل"، ۱۹ اپریل ۱۹۶۵ء

کے الہامی ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے ان میں کونسی کتاب ایسی ہے جو خود اپنے من جانب اللہ ہونے کا دعویٰ کرتی ہو اور پھر تغیّر و تبدّل سے بھی قطعی پاک ہو تو جواب میں قرآنِ حکیم کے سوا کسی کا نام نہیں لیا جا سکتا۔ جو شخص بھی ایسے پیغام خداوندی تک رسائی چاہتا ہو اس کے لیے قرآن کے سوا کسی دوسری کتاب کی طرف رُخ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم سے پہلے جو انبیاء علیہم السّلام آتے رہے وہ ایسے معجزات پیش کرتے رہے جو صرف وقتی طور پر دیکھے اور محسوس کیے جا سکتے تھے، لیکن محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلّم کو جو خاص معجزہ یعنی قرآن کریم عطا ہوا وہ ایسا ہے کہ اس کا اعجاز انسان کے لیے ہمیشہ مشعلِ راہ بنا رہے گا۔ یوں تو قرآن کریم بہت سے مختلف پہلوؤں سے معجزاتِ کثیرہ کا حامل ہے لیکن اس کا اصل معجزہ 'ہدایت' ہے۔

قرآن کریم کی آیاتِ مقدسہ جن معجزات کی حامل ہیں وہ مرورِ زمانہ اور علمی ترقی کے ساتھ ساتھ دنیا میں نمایاں تر اور تابندہ تر ہوتے جا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم یہاں صرف ایک آیتِ کریمہ کے متعلق کچھ گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ یہ آیت احکامِ خمر سے متعلق ہے۔ ہم اس سلسلہ میں اس آیت کے بعض پہلوؤں پر اپنے قلیل علم کی مدد سے کچھ تھوڑی سی روشنی ڈالیں گے۔

خمر اور میسر کا باہمی تعلق ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ - إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَوٰةِ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ -

اس آیت میں خمر اور میسر وغیرہ سے منع کیا گیا ہے۔ جوئے کی برائیاں اربابِ عقل پر ہمیشہ واضح رہی ہیں، لیکن موجودہ سائنسی اور نفسیاتی تحقیق سے اس قرآنی حکم کی جس طرح مکمل تائید ہو رہی ہے شاید قدیم زمانے میں یہ کیفیت نہ تھی۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ خدا سے بالکل منحرف ملک چین بھی جوئے کو اپنے ہاں قانوناً حرام قرار دینے پر مجبور ہو گیا ہے۔

قرآن نے شراب اور جوئے کو ایک ساتھ ذکر کیا ہے اس کی کم از کم تین وجوہ ہیں:

۱۔ ماہر نفسیات نے ان دونوں چیزوں کا گہرا تعلق ثابت کیا ہے۔ دونوں کی تہ میں جنسیات، خاصکر لواطت کے جذبات کام کرتے ہیں اور دونوں حقیقت سے فرار حاصل کرنے کے لیے بطور آلہ کے استعمال کیے جاتے ہیں۔

۲۔ آیت قرآنی يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ الخ (سورۂ بقرہ ۲۱۹) اس بات کو واضح کرتی ہے کہ زمانۂ نزولِ قرآن میں ایک موقعہ پر ان دونوں چیزوں کے بارے میں ایک ساتھ سوال کیا گیا تھا، اس لیے جواب میں بھی ان دونوں کو ایک ربط میں بیان کیا گیا۔

۳۔ عربوں کا یہ طریقہ تھا کہ سخت سردی اور عُسرت کے زمانہ میں شراب کی مجالس قائم کی جاتیں اور ترنگ میں آکر اونٹ ذبح کیے جاتے اور اُن پر جُوا کھیلا جاتا پھر جیتا ہُوا گوشت فقراء و مساکین میں تقسیم کیا جاتا اس طرح خوب فیاضی کی جاتی۔ گویا عرب میں شراب اور جُوا ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ غرباء اور عوام کو اس طرح بظاہر جو فائدہ پہنچتا تھا اس کے باوجود جب قرآن نے ان کو حرام کیا تو لوگوں کو تعجب ہُوا کہ ایسی مفید چیزوں سے اسلام کیوں منع کرتا ہے۔ ان کے اسی سوال کے جواب میں فرمایا گیا کہ ان میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے "منافع" بھی ہیں۔ ان منافع سے مراد یہی منافع ہیں، اس کا اشارہ کسی طبّی یا ذاتی فائدے کی طرف نہ تھا۔ اس نقطہ کو سمجھنے کے لیے اس عہد کی تہذیبی تاریخ سے واقفیت ضروری ہے۔

منافع للناس کا مطلب قرطبی لکھتے ہیں کہ خمر کے نشہ میں بخیل بھی سخی بن جاتا ہے (و تسخی البخیل)۔ علامہ زبیدی تاج العروس میں لفظ "اِثْمٌ" کے تحت لکھتے ہیں۔ قولہ تعالیٰ: قُلْ فِيْهِمَا اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ قال ثعلب کانوا اذا قامروا تقمروا و اطعموا منه و تصدقوا فالاطعام والصدقة منفعة[1] یعنی اللہ تعالیٰ کے ارشاد فیھما اثم کبیر و منافع للناس کے بارے میں ثعلب نے یہ وضاحت کی ہے کہ اہلِ عرب جب جُوا کھیلتے تھے اور ہار جیت ہوتی تھی تو اس کے بعد کھانے کھلائے جاتے اور خیرات بانٹی جاتی تھی یہی کھانے کھلانا اور خیرات دینا وہ منفعت ہے جس کا ذکر آیت میں کیا گیا ہے۔

---

[1] جلد ثالث ص ۵

ایک غور طلب بات یہ ہے کہ دونوں کا اکٹھا ذکر فرما کر کہا گیا ہے کہ ان میں لوگوں کے لیے فائدے کے پہلو بھی نظر آتے ہیں۔ یعنی جب یہ دونوں چیزیں جمع ہو جاتی تھیں تو پھر عرب کے جاہلی معاشرے میں افادہ کا ایک پہلو پیدا ہو جاتا تھا۔ کیونکہ نشے کی ترنگ میں فیاضی کی جاتی تھی۔ اس میں کسی فرد خاص کے فائدے کا ذکر نہیں بلکہ عام لوگوں کو جود وسخا سے جو نفع پہنچتا تھا وہی مذکور ہے۔

شراب کے فائدوں کے متعلق تو بعض لوگوں نے ہرزہ سرائی کی ہے۔ حالانکہ اب ثابت ہو چکا ہے کہ اس میں کوئی فائدہ ہی نہیں بلکہ نقصان ہی نقصان ہے۔ نمونیہ میں یہ فائدہ مند ہونے کے بجائے نقصان دہ ہے اتنی کہ جان لیوا بھی ہو سکتی ہے۔ لوگوں کا یہ خیال کہ یہ محرّک (STIMULANT) ہے، غلط ثابت ہو چکا ہے۔ اس کا اثر شروع سے آخر تک مُسکّن (DEPRESSANT) ہے۔ اب تمام ماہرین اس پر متفق ہو چکے ہیں۔[1]

لیکن جوئے کے فائدے کے متعلق تو کوئی شخص بھی زبان نہیں کھول سکتا۔ جوئے میں اگر ایک شخص کو فائدہ پہنچتا ہے تو دوسرے کو نقصان۔ اس لیے قمار کے سلسلہ میں اگر کسی کو ذاتی فائدہ بھی پہنچتا ہے تو اس کا ذکر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ البتہ عام لوگوں کو جو فیاضی اور صدقہ سے فائدہ پہنچتا تھا، منافع للناس کہہ کر صرف اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر بغیر استحقاق کے ایک شخص کی دولت دوسرے کو پہنچ جائے تو سوسائٹی کا اس میں ایسا کونسا فائدہ ہے جو قرآن اس کا ذکر کرے۔ سوسائٹی کو تو صرف مَیسر کے صدقہ اور خیرات سے فائدہ پہنچتا تھا۔ نشہ میں یہ فیاضی آسان ہو جاتی تھی۔ ترنگ میں آ کر بسا اوقات جیتا ہوا سب کچھ فقراء کو بانٹ دیا جاتا تھا۔

علامہ زمخشری لکھتے ہیں: "مَیسر کے معنی قمار کے ہیں۔ یہ یسر کا مصدر ہے۔ یسرتہ کے معنی ہوئے تونے اس سے قمار بازی کی۔ یہ یسر سے مشتق ہے، جس کے معنی آسانی کے ہیں۔ کیونکہ اس میں دوسرے کا مال بہت اور آسانی سے بغیر محنت و مشقت کے ہاتھ آ جاتا ہے۔ یا یہ یسار سے مشتق ہے کیونکہ اس میں آدمی کی دولت و ثروت سلب ہو جاتی ہے۔ عرب میں مَیسر کا طریقہ یہ تھا کہ ان کے ہاں بغیر پھل اور پَروں کے دس یا زیادہ تیر تھے جن سے پانسوں کا کام لیا جاتا تھا۔ ان میں مختلف نشان ڈال دیئے گئے تھے۔ ان کے نام یہ تھے:

---

[1] DRUGS AND THE MIND DE ROPP. P. 121, 122

فَذ - توام - رقیب - حلس - نافس - مسبل - معلی - منیح - سفیح - وغد -

ان میں سے ہر تیر کا ایک مقرر اور معلوم حصہ تھا جو ان اونٹوں میں سے نکالا جاتا تھا جنہیں وہ ذبح کرتے تھے - صرف تین تیر ایسے تھے، یعنی منیح، سفیح اور وغد، جن کا کوئی حصہ نہ تھا . . . . فذ کا ایک حصہ، توام کے دو، رقیب کے تین، حلس کے چار، نافس کے پانچ، مسبل کے چھ، اور معلی کے سات حصے تھے - ان تمام تیروں کو ایک تھیلے میں ڈالا جاتا اور وہ تھیلا کسی معتبر آدمی کے ہاتھ میں دے دیا جاتا - پھر خوب ہلا کر ان تیروں کو آپس میں ملا دیا جاتا - اس کے بعد ہر ہر آدمی کا نام لے کر باری باری تیر نکالے جاتے جس کے نام پر مقرر حصہ والا تیر نکلتا وہ اپنا حصہ لے لیتا، اور جس کے نام بے حصے والا تیر نکلتا اس کو کچھ نہ ملتا، بلکہ تمام جانوروں کی قیمت اُسے ادا کرنی پڑتی - پھر یہ تمام جیتا ہوا گوشت یہ قمار باز خود نہ کھاتے بلکہ فقراء میں تقسیم کر دیتے اور اس پر فخر کیا کرتے اور جو اس شراب نوشی اور قمار بازی میں حصہ نہ لیتا اس کو بخیل سمجھتے اور اس کا نام "برم" (کنجوس) رکھتے تھے - آگے چل کر علامہ زمخشری لکھتے ہیں کہ قمار کی تمام اقسام مَیْسِر ہی کے حکم میں ہیں جن میں چوسر اور شطرنج وغیرہ شامل ہیں -

امام بَغَوی لکھتے ہیں کہ مَیْسِر کی اصل ذبح کے اونٹوں سے تعلق رکھتی ہے - اور یہ اس طرح ہوتا کہ عرب میں اہلِ ثروت جانور خریدتے اور پھر ان کو ذبح کرتے (یعنی جُوا کھیل کر)، پھر ان ذبح شدہ جانوروں کو فقراء میں تقسیم کر دیا جاتا اور اس میں سے قمار باز لوگ خود کچھ نہ کھاتے اور اپنی اس فیاضی پر فخر کرتے اور جو اس جوئے بازی میں شریک نہ ہوتا اس کو عیب لگاتے -

مرتضیٰ زبیدی تاج العروس میں لفظ مَیْسِر کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: جب عرب قمار بازی کرنا چاہتے تو ایک اونٹ قرض لیتے اور اس کو ذبح کرتے اور اس کے ۲۸ حصّے کرتے تھے . . . . ذبح کے اونٹ کا نام مَیْسِر اس لیے پڑا کہ اس کے اجزاء الگ کیے جاتے تھے، گویا وہ موضوعِ تجزیہ تھا -

خازن لکھتے ہیں، کبھی ایسا ہوتا کہ ان میں سے ایک شخص ایک ہی نشست میں سو اونٹ داؤ پر لگاتا اور اُسے مالِ کثیر حاصل ہوتا - پھر وہ اس مال کو محتاجوں میں بانٹ دیتا اور اس کی بڑی ناموری ہوتی - یہی وہ منفعت ہے جس کی طرف قرآن مجید میں اشارہ کیا گیا ہے -

امام قُرطُبی اپنی تفسیر میں اِس پر تفصیل سے گفتگو کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ عربوں کی عادت تھی کہ وہ سخت

سردی، عسرت اور قحط کے زمانہ میں یہ فعل کیا کرتے۔ قمار باز ضمانت پر اونٹ وغیرہ لیتے، اور قمار بازی کرنے کے بعد سب کچھ فقراء میں تقسیم کر دیتے، اس پر فخر کرتے اور اس میں حصّہ نہ لینے والے کو برا سمجھتے اور اس کا نام کنجوس رکھتے . . . یہی اس جوئے کا نفع تھا، ورنہ اصل میں تو یہ دوسروں کا مال باطل طریقے سے لینا ہے۔ (شراب کے نشہ میں یہ فیاضی آسان ہو جاتی تھی۔ امام قرطبی کا یہ قول پہلے گزر چکا ہے)

پس ہم دیکھتے ہیں کہ قدیم عرب میں شراب اور مَیسِر ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم تھے۔ تاش وغیرہ میں تو بعض اوقات کچھ تھوڑا بہت حصّہ انسان کے فہم یا مشق کا ہو سکتا ہے، لیکن مَیسِر تو بالکل فال کی طرح ایک اتفاقی چیز ہوتی تھی۔ قرآن نے اس موقع پر قمار کا لفظ استعمال نہیں کیا ہے بلکہ مَیسِر کہا ہے جو جوئے کی خاص قسم تھی تاکہ اس کا شراب کے ساتھ مل کر فقراء کے لیے نفع کا جو پہلو نکلتا تھا اس کی تخصیص ہو سکے۔ جاہلیت کے زمانے میں عرب کے لوگ شراب پی کر اونٹ ذبح کرنے اور کھانا کھلانے کے اس قدر (CONDITIONED) عادی ہو چکے تھے کہ بعض اوقات جوئے کے سلسلہ کے بغیر ہی شراب کی ترنگ میں جو اونٹ ملتا اس کو پچھاڑ ڈالتے تھے، اور یہ نہیں دیکھتے تھے کہ کس کا ہے اور لوگوں کو اس کے کباب بنا کر کھلا دیتے اور غربا میں بھی تقسیم کرتے۔ سیرت النبیؐ جلد ششم میں شبلیؒ نے اس کا ذکر کیا ہے اور مثال کے طور پر سبعہ معلقہ میں طرفہ کے قصیدے اور صحیح بخاری میں حضرت حمزہ کے قصے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

روسی ماہرِ نفسیات (PAVLOV) نے CONDITIONING (عادی ہونا) کے تجربے کتّے پر کیے تھے جس کو گھنٹی بجنے کے ساتھ کھانا ملتا تھا۔ پھر جب یہ عادت پختہ ہو گئی تو صرف گھنٹی سننے ہی سے اس کی رال ٹپکنی شروع ہو جاتی تھی چاہے کھانا کہیں بھی نہ ہو۔ عرب کے لوگ بھی شراب اور مَیسِر کے معاملہ میں اسی نوعیت کے عادی ہو چکے تھے۔

یہاں سے ایک یہ مسئلہ بھی مستنبط ہوتا ہے کہ اگر جوا اس شرط سے کھیلا جائے کہ جیتا ہوا مال خیرات کر دیا جائے گا پھر بھی جوا حرام ہی ہوگا۔

یہاں سے امام قرطبی نے ایک عمدہ دلیل ہر قسم کے نشہ کی حرمت پر اخذ کی ہے وہ یہ کہ مَیسِر جوئے کی خاص قسم ہے، لیکن علماء کا اس پر اجماع ہے کہ ہر قسم کا جوا بالکل مَیسِر ہی کی طرح حرام ہے۔ اسی طرح چاہیے

خمر کے معنی صرف انگور کی شراب کے ہوں، لیکن اس مثال کے مطابق ہر قسم کا نشہ خمر ہی کی طرح حرام قرار پائیگا۔
امام موصوف کے الفاظ یہ ہیں:

والخمر ماء العنب الذی غلا او طبخ وما خامر العقل من غیرہ فھو فی حکمہ۔ لان اجماع العلماء ان القمار کلہ حرام ۔۔۔۔ وانما ذکر المیسر من بینہ فجعل کلّہ قیاساً علی المیسر۔ والمیسر انما کان قمار خاصۃ کذالک کل ما کان کالخمر فھو بمنزلتھا۔

خمر انگور کے اس رس کو کہتے ہیں جو سڑ گیا ہو یا پکایا گیا ہو۔ رہیں دوسری وہ چیزیں جو عقل کو ڈھانک لیتی ہیں، تو وہ خمر ہی کے حکم میں ہیں، کیونکہ علماء کا اس پر اجماع ہے کہ ہر قسم کا جوا حرام ہے، حالانکہ قرآن میں جوئے کی صرف ایک قسم "مَیْسِر" کا ذکر کیا گیا ہے۔ مگر علماء نے اس پر قیاس کر کے تمام جوؤں کو حرام قرار دیا ہے۔ ایسا ہی معاملہ تمام شرابوں کا بھی ہے کہ ہر وہ چیز جو خمر کی طرح ہو وہ خمر کے حکم میں ہے۔

(باقی)

اِس دَور میں قرآن کی صحیح خدمت کیا ہے؟

ابوالاعلیٰ مودودی

[یہ ایک پیغام ہے جو نزولِ قرآن کی چہار صد سالہ تقریب کے موقع پر اسلامی کانفرنس میں پیش کرنے کے لیے ادارہ تحقیقاتِ اسلامیہ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر فضل الرحمٰن کو بھیجا گیا تھا۔ افسوس ہے کہ میں خود اپنی خرابیٔ صحت کے باعث اس میں شرکت سے معذور رہا۔ ابوالاعلیٰ]

میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں گا اگر آپ حاضرینِ مجلس تک میرا اسلام اور یہ پیغام پہنچا دیں کہ جس مبارک مقصد کے لیے آپ جمع ہوئے ہیں، میں اُس میں قلب و روح کے ساتھ آپ کا شریک ہوں اور دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے کلامِ پاک کے صحیح فہم، اور اِس نازک دَور میں اُس کی صحیح تبلیغ، اور زندگی کے اہم مسائل پر اس کی تعلیمات کی صحیح تطبیق کی توفیق عطا فرمائے۔ اللہ جل شانہٗ نے اپنے آخری نبیؐ پر اپنی کتاب اس اعلان کے ساتھ نازل کی ہے کہ اُس میں دین کی تکمیل کر دی گئی ہے اور اب دنیا میں نہ کوئی نبی آنے والا ہے نہ کوئی کتاب۔ اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قرآن پوری نوعِ انسانی کے لیے تمام دنیا میں اور تمام زمانوں میں ایک مستقل ہدایت ہے۔ کیونکہ اگر کسی زمانے یا کسی خطۂ زمین یا انسانی معاشرے کی کسی حالت کے لیے بھی اس کی ہدایت ناکافی یا محتاجِ تکمیل ہو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ اعلان غلط ہے، حالانکہ اللہ اس سے پاک اور برتر ہے کہ اس کی کوئی بات غلط ہو۔ لہٰذا مسلمان ہونے کی حیثیت سے مسائلِ حیات کی ہر بحث میں ہمارا اوّلین نقطۂ آغاز یہ ہونا چاہیے کہ ہمارے لیے اصل سرچشمۂ ہدایت یہ کتاب ہے اور رہنمائی حاصل کرنے کے لیے اسی کی طرف ہم رجوع کریں گے۔

"یہ نقطۂ آغاز" کا سوال ہی اِس وقت پوری دنیا میں مسلمانوں کے اہلِ فکر و نظر اور رہنما طبقوں کے لیے بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اگرچہ ہمارا اصل کام دنیا کو خدائی ہدایت کی طرف دعوت دینا ہے، لیکن

بدقسمتی سے جدید مادّی تہذیب کے ہمہ گیر غلبہ نے خود ہمارے اپنے اندر یہ سوال پیدا کر دیا ہے کہ ہم جملہ مسائلِ حیات میں قرآن کو اصل سرچشمۂ ہدایت مانتے بھی ہیں یا نہیں، اور مانتے ہیں تو خلوص اور سنجیدگی کے ساتھ مانتے ہیں یا نہیں۔ اس لیے ہم بحیثیت ایک مُسلم مِلّت کے اپنے عالمگیر منصب کا حق ادا نہیں کر سکتے جب تک خود اپنے اندر اس سوال کو طے نہ کریں، اور ہم بڑے خوش قسمت ہوں گے اگر نزولِ قرآن کی پندرھویں صدی کا آغاز اسی سوال کے ایک قطعی اور واضح جواب سے کریں۔

ہمارے رہنما اور کارفرما طبقوں میں کچھ عناصر ہیں جو قرآن کو اس دَور میں سرچشمۂ ہدایت نہیں مانتے یا کم از کم اِس میں شک ضرور رکھتے ہیں۔ وہ ایسے اطمینان بخش دلائل کے محتاج ہیں جن سے ان کو یہ یقین حاصل ہو جائے کہ انسان رہنمائی کے لیے خدا کی ہدایت کا محتاج ہے اور یہ قرآن واقعی خدا ہی کی طرف سے ایک محفوظ، کامل اور ابدی ہدایت ہے۔

کچھ دوسرے عناصر ہیں جو دین و دنیا کی تقسیم کا نظریہ اختیار کر چکے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنے مخصوص تصورات کے مطابق جس چیز کو "دین" سمجھ بیٹھا ہے صرف اُسی کے دائرے تک قرآن کی ہدایت کو محدود رکھنا چاہتا ہے۔ اِس طرح کے لوگوں کی غلط فہمیاں رفع نہیں ہو سکتیں جب تک کہ دین و دنیا کی اِس بے معنی تقسیم پر فیصلہ کُن ضرب نہ لگائی جائے اور مضبوط دلائل کے ساتھ یہ نہ ثابت کر دیا جائے کہ انسان اپنی پُوری زندگی کے معاملات میں خدا کی ہدایت کا محتاج ہے اور قرآن زندگی کے ہر پہلو میں بالکل ٹھیک ہدایت دیتا ہے۔

کچھ اور عناصر ہیں جو قرآن کی ہدایت کو جامع اور ہمہ گیر مانتے ہیں، مگر جب اُس سے استفادے کا سوال سامنے آتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ کسی کے لیے رہنمائی کا اصل ماخذ و منبع قرآن سے باہر کسی اور جگہ ہے جہاں سے نظریات و تصورات لا کر وہ قرآن سے ان کی تصدیق و توثیق کرانے کے لیے زور لگا رہا ہے۔ اور کسی کی کوشش یہ ہے کہ قرآن کا تعلق نہ صرف سنّتِ رسول سے کاٹ کر، بلکہ پچھلی چودہ صدیوں میں اُمّت کے علماء و فقہاء اور مفسرین نے معانیٔ قرآن کی تشریح اور تعلیماتِ قرآن سے اخذ و استنباط کا جو کچھ کام کیا ہے اس سب سے بے نیاز ہو کر، اُس کا اپنا ذہن الفاظِ قرآن سے جو مفہوم اخذ کرتا ہے صرف اُس سے ہدایت حاصل کرے۔

یہ دونوں مسلک ایسے ہیں جنہیں کوئی معقول آدمی قرآن کی ہدایت سے استفادے کی صحیح صورت نہیں مان سکتا، اور ان کی بنیاد پر امتِ مُسلمہ کا کوئی ایک نظامِ فکر و عمل بھی نہیں بن سکتا، کیونکہ نہ امت کا اجتماعی ذہن کبھی اِن تعبیرات و تفسیرات کو قبول کر سکتا ہے، اور نہ خود اِن لوگوں کے درمیان اپنی تعبیرات میں اتفاق ممکن ہے۔ اس لیے اِن مسلکوں کے فروغ پانے کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ مسلمانوں میں مزید تفرقے رونما ہوں، اُن کے ذہنوں میں اپنے دین کے متعلق نئی نئی الجھنیں پیدا ہوں، اور دنیا کو ہدایتِ الٰہی کی طرف دعوت دینے کے بجائے وہ خود اپنی جگہ ہی اِس پریشانی میں مبتلا رہیں کہ وہ ہدایت فی الواقع ہے کیا۔ لیکن اِس کا علاج بھی طعن و تشنیع نہیں ہے، بلکہ دراصل یہ عناصر اِس کے محتاج ہیں کہ معقول اور اطمینان بخش دلائل سے اُن کو قرآن کی ہدایت سے استفادے کا صحیح طریقہ بتایا جائے اور جن طریقوں کو وہ اختیار کر رہے ہیں ان کی غلطی واضح کی جائے۔

لغزشِ قدم کے اِن مواقع سے جو لوگ بچ گئے ہیں ان کے معاملہ میں بھی یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ فی الحقیقت قرآن کو اصل سرچشمۂ ہدایت ماننے میں وہ کس حد تک سنجیدہ ہیں۔ اس معاملہ میں سنجیدگی کے معنی صرف اتنے ہی نہیں ہیں کہ ہم خلوصِ دل کے ساتھ قرآن کے متعلق یہ عقیدہ رکھیں، اور اس کے معنی یہ بھی نہیں ہیں کہ ہم اِس عقیدے کے صرف اعلان و اظہار پر اکتفا کریں، بلکہ ہمارے سنجیدہ ہونے کا اصل تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں عملاً اُس سرچشمۂ ہدایت کی طرف رجوع کریں، اور جو رہنمائی اُس سے ملتی ہے اُس کے مطابق اپنے اخلاق و معاملات اور طرزِ زندگی کو، اپنے تمدن اور اُس کے قوانین کو، اپنے نظامِ تعلیم اور نظامِ معیشت اور نظامِ سیاست کو بالفعل ڈھالنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ میرا احساس اور مشاہدہ یہ ہے کہ ہمارے رہنما اور کارفرما طبقوں میں جہاں صحیح اعتقاد موجود ہے وہاں بھی اِس معیار کی سنجیدگی مفقود ہے، یا اگر مفقود نہیں تو کم از کم معیارِ مطلوب سے بہت فروتر ہے۔ ہمیں اِس سنجیدگی کو پیدا کرنے کی کوشش سب سے پہلے کرنی چاہیے، کیونکہ جب تک یہ پیدا نہ ہو، مسائلِ زندگی پر قرآنی تعلیمات کے انطباق کی علمی بحثیں کاغذ کی زینت ہی بنی رہیں گی، عمل کی دُنیا میں اُن کا کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔ دنیا صرف اِن کاغذی بحثوں سے اسلام کے برحق ہونے کی قائل نہیں ہو سکتی۔ اُسے قائل کرنے کے لیے ناگزیر ہے کہ ہماری قومی

رسائل و مسائل

نقد سرمایہ کی زکوٰۃ اور اس کا نصاب

سوال:- زکوٰۃ بالخصوص نقدی پر زکوٰۃ کے متعلق میرے ذہن میں بعض شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں، جن کا کوئی اطمینان بخش جواب نہیں مل سکا۔ اس لیے ان کے ازالے کی خاطر آپ سے رجوع کر رہا ہوں۔ میرے اعتراضات کا خلاصہ یہ ہے کہ آج کل نقد سرمایہ سونے یا چاندی کی شکل میں کسی صاحبِ نصاب کے قبضے میں نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نقدی کے عوض میں سونا خزانے میں جمع ہے لیکن ہمارے ہاتھ میں جو کچھ ہے۔ وہ صرف کرنسی کے نوٹ ہیں جن پر وعدہ ادائیگی تحریر ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان نوٹوں پر زکوٰۃ کس بنیاد پر عائد ہو گی۔

تاہم اگر ان نوٹوں کو سونے چاندی کے مشابہ قرار دے کر ان پر زکوٰۃ فرض ہو، تو پھر دوسرا سوال

(اس دور میں قرآن کی صحیح خدمت کیا ہے؛ بقیہ صفحہ ۵۵)

۴۔ زندگی میں اسلام اُس کو جلوہ گر نظر آتے۔ اِس کے بغیر ہم خفیہ بھی اسلام کی تبلیغ کریں گے اُس کے آگے دنیا کو ایک بہت بڑی علامتِ استفہام ہی لگی نظر آئے گی جس میں یہ سوال پوشیدہ ہو گا کہ کیا یہ امت؛ جو اپنی مسجدوں کے باہر زندگی کے ہر شعبے میں دوسروں کے افکار و نظریات، تہذیب، قوانین اور اصولوں کی تقلید کر رہی ہے، فی الواقع اسلام کو خود بھی برحق سمجھتی ہے؟

یہ چند امور ہیں جن کی طرف میں اہلِ علم کے اس گراں قدر اجتماع کو توجہ دلانا چاہتا ہوں اور توقع رکھتا ہوں کہ ان کو التفات کا مستحق سمجھا جائے گا۔

یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کے لیے نصاب سونے کا معتبر ہوگا یا چاندی کا۔ ہندو پاکستان کے علماء بالعموم نوٹوں کو چاندی پر قیاس کرتے ہیں اور چاندی کے نصاب یعنی پچاس روپے کو نقد سرمایہ کا نصاب تجویز کرتے ہیں۔ معلوم نہیں سونے کو چھوڑ کر کرنسی کو چاندی کے مانند قرار دینا ہمارے علماء کا ایجاد کردہ مسئلہ ہے یا پہلے فقہاء کا بھی یہی فتویٰ تھا۔ اگر سکہ چاندی کا ہو یا کم از کم اس کی آمیزش میں چاندی غالب ہو، تب تو اسے چاندی کے تحت لانا صحیح تھا لیکن جب چاندی ہی سرے سے غائب ہوگئی تو پھر بھی نوٹ کو چاندی سے ملانا سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر اس معاملے میں چاندی کے بجائے سونے کے نصاب کو بنیاد بنایا جائے تو اس میں کیا مضائقہ ہے۔

جواب: (از ملک غلام علی صاحب)۔ یہ ایک لاطائل نکتہ آفرینی ہے کہ نقد سرمایہ اگر سونے یا چاندی کے بجائے زرِ کاغذی کی شکل میں ہو، تو اس پر زکوٰۃ کا وجوب مشکوک ہو جائے گا۔ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ سونے اور چاندی کے محلِ زکوٰۃ ہونے کی بنیادی علت یہ ہے کہ ان کی وساطت سے انسان اپنا زائد از ضرورت اور پس انداز اندوختہ محفوظ رکھ سکتا ہے اور جب چاہے جہاں چاہے خرچ کر سکتا ہے، یعنی ان سے اپنی یا دوسروں کی ضروریات فراہم کر سکتا ہے۔ ارشادِ ربانی وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُونَهَا ...... میں سونے چاندی کے متعلق یَکْنِزُوْنَ اور یُنْفِقُوْنَ کے الفاظ صاف اشارہ کر رہے ہیں کہ ان دونوں چیزوں کو بطور خزانہ ذخیرہ بھی کیا جا سکتا ہے اور ان کے ذریعے سے حاجات زندگی بھی پوری کی جا سکتی ہیں۔ ایک مدت دراز تک یہ دونوں کام سونے چاندی یا ان کے سکوں سے لیے جاتے رہے، لیکن آج اس کی جگہ کاغذی سکے نے لے لی ہے۔ آپ اسے جمع بھی کر سکتے ہیں اور اسے خرچ کر کے ہر اس ضرورت کی تکمیل بھی کر سکتے ہیں جس کے لیے ایک زمانے میں سونا یا چاندی درکار تھا۔ آج آپ نوٹ لے کر کسی دکاندار کے پاس جائیں یا اسے کسی حاجتمند کے حوالے کریں تو وہ یہ نہیں کہے گا کہ یہ تو محض کاغذی وعدہ ہے، مجھے اس کے بجائے سونا دو یا چاندی دو۔ بلکہ نوٹ کے بدلے میں اگر آپ سونا یا چاندی دینا چاہیں، تو وہ تامل و تردد میں پڑ جائے گا۔ بہرکیف جس سکے میں ثمن ہے اور بازار میں جس کا چلن ہے وہ سونے چاندی کا ہر لحاظ سے قائم مقام ہے، خواہ وہ لوہے کا ہو، چمڑے کا ہو، یا کاغذ کا ہو۔ اس پر زکوٰۃ بالکل اسی طرح فرض ہے جس طرح سونے چاندی پر فرض ہے۔

یہ سوال البتہ لائقِ غور ہے کہ جو کرنسی سونے یا چاندی سے بنی ہوئی نہیں ہے اس کے نصاب کا تعین کیسے ہو؟ یہ تو ظاہر ہے کہ ایسی کرنسی چونکہ سیم و زر کے حکم میں داخل ہے، اس لیے لامحالہ اسے نصاب کے معاملے میں بھی چاندی یا سونے ہی پر قیاس کیا جائے گا۔ اب فقہائے امت کا تعامل یہ بتا رہا ہے کہ جو سکہ طلائی ہے یا کم از کم اس میں غالب عنصر سونے کا ہے، اس کا نصاب تو سونے کا نصاب یعنی بیس مثقال یا بیس دینار ہوگا اور دوسرے تمام سکوں میں چاندی کا نصاب، یعنی دو سو درہم یا ان کے ہم وزن چاندی کی قیمت کا اعتبار ہوگا۔ یہ چیز ہمارے فقہائے کرام کے حزم و احتیاط اور اجتہادی بصیرت پر دلالت کرتی ہے۔ کہ جنسِ ذہب کی حد تک تو انہوں نے سونے کا نصاب وہی مانا ہے جو بعض روایات میں مذکور ہے لیکن سونے کے ماسوا جتنے بھی اموال ایسے ہیں جن کا نصاب غیر منصوص ہے، انہیں چاندی پر قیاس کیا ہے اور ان میں غیر طلائی سکے بھی شامل ہیں۔ چنانچہ فتاویٰ عالمگیری کی عبارت ملاحظہ ہو: الدراھم اذا کانت مغشوشۃ فان کان الغالب ھو الفضۃ فھی کالدراھم الخالصۃ وان غلب الغش فلیس کالفضۃ فلینظر ان کانت رائجۃ او نوی التجارۃ اعتبرت قیمتھا فان بلغت نصاباً من ادنی الدراھم التی تجب فیھا الزکوٰۃ وجبت فیھا الزکوٰۃ (اگر درہم میں ملاوٹ ہو مگر چاندی غالب ہو تو وہ خالص چاندی کے درہم شمار ہوں گے، یعنی ان پر باعتبار وزن چاندی کی زکوٰۃ ہوگی اور اگر ملاوٹ غالب ہو تو پھر وہ چاندی کے مانند نہ ہوں گے۔ پس دیکھنا ہوگا کہ اگر وہ رائج الوقت ہوں یا ان سے تجارت مقصود ہو تو ان کی قیمت کا اعتبار ہوگا، اگر یہ قیمت درہموں کی اس کم ترین مقدار کی قیمت کو پہنچ جائے جس پر زکوٰۃ واجب ہے۔ تو ان ملاوٹ والے سکوں میں بھی زکوٰۃ واجب ہوگی)۔ اب آج کل کے مروج سارے سکے، کاغذی نوٹوں سمیت، دراہم مغشوشہ کی تعریف میں آسکتے ہیں، اس لیے ان کی قانونی قیمت کے لحاظ سے ان پر زکوٰۃ عائد ہوگی اور ان کا نصاب چاندی کا نصاب ہوگا۔ سونے کے بجائے ان میں چاندی کا نصاب اختیار کرنے کے حق میں متعدد دلائل و وجوہ موجود ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اموالِ تجارت میں دو سو درہم چاندی کے مساوی نصاب کا ذکر بعض روایات و آثار میں آیا ہے اور نقود اور تجارتی اموال میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس لیے اگر متاعِ تجارت کے نصاب میں سونے کی جگہ چاندی کو اصل قرار دیا جائے تو اسی کا اطلاق آپ سے آپ نقد سرمایہ پر بھی ہونا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ سند اور صحت کے اعتبار سے چاندی کے

نصاب پر مشتمل احادیث کا درجہ نہایت اعلیٰ ہے، حتیٰ کہ صحیحین میں جہاں پانچ اوقیہ کا نصاب مذکور ہے وہاں بھی محدثین کے نزدیک بالاتفاق چاندی کے دو سو درہم مُراد ہیں۔ یہ خصوصیت ان احادیث کو حاصل نہیں جن میں سونے کا نصاب مروی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ جن اموال کا نصاب محتاجِ تعیّن ہے اور وہ سونے یا چاندی سے مماثلت رکھتے ہیں ان میں چاندی کو بنیاد بنانا اس وجہ سے بھی اَولیٰ خیال کیا جاسکتا ہے کہ اس سے مستحقین زکوٰۃ کو زیادہ فائدہ پہنچے گا۔

بہرکیف ائمہ و فقہاء اسلام نے اگر نقد سرمایہ پر زکوٰۃ کو واجب ٹھیرایا ہے اور اس کے نصاب میں سونے کے بجائے چاندی کو اصل بنایا ہے تو اس کے حق میں مضبوط نقلی و عقلی دلائل موجود ہیں اور یہ پاکستان و ہند کے علماء کا کوئی من گھڑت مسئلہ نہیں۔ یہ کہنا بھی درحقیقت درست نہیں، بلکہ غلط فہمی پر مبنی ہے کہ ان دیار کے علماء نے نقدی کا نصاب مستقل طور پر پچاس روپے طے کر دیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جس دَور میں علمائے کرام نے یہ نصاب تجویز کیا تھا، اُس دور میں روپیہ چاندی کا تھا یا چاندی اس میں جزوِ اعظم کی حیثیت رکھتی تھی اور اس کا وزن ایک تولہ تھا۔ اس لحاظ سے اس زمانے میں پچاس یا باون روپے تقریباً دو سو درہم (۵۲½ تولے) چاندی کے ہم وزن اور ہم قیمت تھے۔ اس لیے ایک عام فہم مسئلہ بیان کر دیا گیا کہ پچاس روپے پر زکوٰۃ ہوگی۔ بعد میں صورتحال بالکل بدل گئی۔ اب نہ وہ چاندی کا روپیہ ہے اور نہ پچاس تولے چاندی کی قیمت پچاس روپے ہے۔ اس لیے اب روپے پیسے کے نصاب میں ساڑھے باون تولے چاندی کی بازاری قیمت کو بنیاد بنایا جائے گا اور یہ روزنامہ اخبارات سے معلوم کی جاسکتی ہے۔ جس شخص کے پاس سال بھر اس قیمت کے برابر روپیہ ہوگا، وہ زکوٰۃ دے گا۔

مطبُوعات

گلزارِ تبسم | مرتب: جناب فضل الٰہی عارف صاحب۔ شائع کردہ: ادارہ بتول، اچھرہ۔ لاہور قیمت ۲٫۴۷ روپے
صفحات ۱۷۱۔

ہر زبان کے ادبی سرمائے میں طنز و مزاح کو ہمیشہ غیر معمولی اہمیت حاصل رہی ہے۔ طنز کے گھاؤ گہرے ہوتے ہیں مگر مزاح میں انسان بڑے لطیف انداز سے اُن تلخ حقائق کی طرف دوسروں کو متوجہ کرتا ہے جنہیں شاید عام حالات میں لوگوں کو سننے کی تاب نہ ہو۔ مزاح کا جوہر نہایت ذہین اور فطین انسانوں ہی میں پایا جاتا ہے۔ مزاح کوئی دل لگی نہیں بلکہ حکمت اور دانائی کی بات کو اس طرح بیان کرنا ہے کہ نہ تو سمجھنے میں اسے کوئی دقت ہو اور نہ قبول کرنے میں انہیں بوجھ محسوس ہو۔

اسلام نے اُمتِ مسلمہ کو جو قومی مزاج عطا کیا ہے اُس میں مزاح کا ایک خاص مقام ہے۔ فضل الٰہی عارف صاحب نے بڑے سلیقے کے ساتھ علم و حکمت کے ان انمول موتیوں کو جمع کیا ہے۔ یہ کتاب بڑی مفید اور کارآمد ہے اور اسلامی ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔

گلدستۂ نماز | مرتب: جناب فضل الرحمٰن کلیم صاحب۔ شائع کردہ: ادارہ بتول۔ ۴۔ اے ذیلدار پارک اچھرہ۔ لاہور۔ اس کتابچے میں پوری نماز، اس کا ترجمہ اور تشریح شامل ہے۔ ترجمے کا انداز حکیمانہ ہے۔ یعنی پہلے ایک ایک لفظ کا الگ الگ ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔ پھر الفاظ کو جوڑ کر فقروں کا ترجمہ لکھا جاتا ہے، اس کے بعد بامحاورہ ترجمہ دیا جاتا ہے اور آخر میں مختصر سی تشریح درج کی جاتی ہے۔ کتاب کو بڑی صحت اور صفائی کے ساتھ نہایت اچھے کاغذ پر آفسٹ میں شائع کیا گیا ہے۔

اقبال قلندر نہیں تھا | تالیف: جناب صائب عاصمی صاحب۔ شائع کردہ: تخلیق کار پوسٹ بکس نمبر ۲۰۔

جی۔ پی۔ او، لاہور۔ قیمت دو روپے صفحات ۲۲۰۔

اقبال مرحوم کوئی پیغمبر یا نبی نہ تھے کہ اُن کی زندگی ہر خطا سے پاک اور اُن کا کلام ہر عیب سے منزہ ہوتا۔ ان کی حیات کے بعض گوشوں اور اُن کے کلام کے بعض حصّوں پر نقد و جرح کی جا سکتی ہے مگر چند سالوں سے ان کی شخصیت کو مسخ کرنے اور اُن کے کلام کو بے وزن بنانے کے لیے اس ملک کا ایک مخصوص بے دین طبقہ جس طرح کوشش کر رہا ہے اُس پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اقبال کی تذلیل اور اس کے پیغام کی تنقیص کن ناپاک عزائم کو سامنے رکھ کر کی جا رہی ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب اس مذموم کوشش کا ایک نمونہ ہے۔ آپ اگر مصنف کے قلم سے نکلی ہوئی مندرجہ ذیل سطور کو نگاہ میں رکھیں تو آپ کو خود یہ معلوم ہو جائے گا کہ اقبال کے خلاف یہ زہر کیوں اُگلا جا رہا ہے:

"اقبال ایک مذہبی شاعر ہے اور مذہب انسانیت کے عالمِ طفولیت کی یادگار ہے۔ جوں جوں انسان کا شعور ترقی کرتا گیا، یہ تحریکیں بھی جنہیں مذاہب کا نام دیا جاتا ہے شعوری ترقی کا پیغام لاتی رہیں۔ چنانچہ ہر دور کا افکار انہی تحریکات کا ایک فطری محرک ہے اور اقبال ایک طرف ماضی ہی کے احیاء کو مستقبل کا ضامن سمجھتا ہے۔ خواہ یہ ماضی فی الواقع زہرناک ہو کیونکہ کوئی ہوشمند انسان ماضی کا سہارا نہیں لیتا"۔ ص۵۵

اقبال نے مسلمان قوم کو بیدار کرنے کے لیے جو طریقہ اختیار کیا وہ نیا نہیں تھا اس سے پہلے مفتی عبدہٗ، جمال الدین افغانی، سر سید، حالی اور کئی دیگر لوگوں نے اپنے اپنے انداز میں یہی باتیں دہرائی ہیں۔ اقبال جنہیں اپنے رنگ میں دُہرا کر حکیم الامت کہلایا۔ اقبال نے ببیل یا رجسٹرڈ ٹریڈ مارک کے طور پر انسانیت کو ایک پیغام دینے کا اسلوب اختراع کیا اُس کے پیغام کی علتِ غائی ماضی پرستی پر مبنی تھی۔ حالانکہ انسانیت اس دور میں کسی رجسٹریشن کی متحمل نہیں ہو سکتی"۔ ص۴۹

یہ ہیں مذہب خصوصاً اسلام کے متعلق مصنف کے خیالات و احساسات، اور اسی نسبت کی بنا پر وہ اقبالؒ سے سخت ناراض ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ اقبال محض طالع آزما تھا۔ اُس نے مختلف میدانوں کی خاک چھان کر جب ترقی کی راہیں مسدود پائیں تو اسلام کے نام پر لوگوں کے جذبات سے کھیلنا شروع کیا اور اس طرح عزت و

شہرت حاصل کی۔

اس کتاب کے مطالعہ سے مصنّف کے علم اور طرزِ استدلال کے بارے میں کوئی اچھی رائے قائم نہیں کی جاسکتی تعلّی اور اپنی قابلیت کا حد سے بڑھا ہوا احساس اُن کی تحریر سے پُوری طرح جھلکتا ہے۔ مثلاً اپنے متعلق اُن کا یہ ارشاد ملاحظہ فرمائیں: "راقم الحروف کی ابھی مَسیں بھیگ رہی تھیں مگر با درِ فطرت کے ایک فطری لاڈلے فنکار کی حیثیت سے متحدہ ملک کے تقریباً سبھی قابلِ ذکر معیاری جریدوں اور رسالوں میں کلام چھپ کر اہلِ فکر و نظر سے خراجِ تحسین وصول کر رہا تھا" صٹ

کتاب کے آغاز میں انہوں نے اپنے اسمِ گرامی کے ساتھ ایم، اے نفسیات بھی تحریر فرمایا ہے مگر مذہب کے متعلق انہوں نے جو باتیں کی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مذہب کے نفسیات اور اس کے فلسفے کی ابجد سے بھی واقف نہیں۔ انہیں ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ انسان کی باطنی کیفیات اور نظامِ شریعت میں کیا تعلق ہے۔ اور اوامر و نواہی کا خارجی نظام ان کیفیات کی تہذیب کے لیے کیا فرض انجام دیتا ہے۔ افسوس ہے کہ جس موضوع کو بنیاد بنا کر انہوں نے قلم اٹھایا ہے اُس میں ماہرانہ دسترس تو کیا وہ معمولی شُدبُد بھی نہیں رکھتے۔

ڈاکٹر اقبال فلسفۂ مذہب پر نہایت گہری نظر رکھتے تھے، اس لیے ان کے افکار و نظریات پر تنقید کے لیے کسی نہایت وسیع اور عمیق مطالعہ والے شخص کو ہی آگے بڑھنا چاہیے۔ صائب عاصمی صاحب نے جس سطحی اور عامیانہ انداز میں علامہ مرحوم پر جرح کی ہے اُس سے دل کی بھڑاس تو نکالی جا سکتی ہے مگر علم کی کوئی خدمت نہیں ہو سکتی۔

کتاب میں کتابت کی غلطیوں کے علاوہ زبان کی بھی بے شمار غلطیاں ہیں۔

معارف الحدیث جلد چہارم | تالیف۔ مولانا محمد منظور نعمانی صاحب۔ شائع کردہ: کتب خانہ الفرقان، لکھنؤ بھارت۔ قیمت مجلّد: چھ روپے پچاس پیسے۔ غیر مجلّد ۵ روپے پچیس پیسے۔ صفحات ۲۹۶۔

احادیثِ نبوئی کی تفہیم کا جو مفید سلسلہ مولانا محمد منظور نعمانی صاحب نے شروع کیا ہے یہ اُس کی چوتھی کڑی ہے۔ اس حصے میں کتاب الزکوٰۃ، کتاب الصوم اور کتاب الحج شامل ہیں۔ اس حصے میں بھی فاضل مصنف نے

احادیث کی ترتیب، تشریح اور توضیح کا وہی انداز اختیار کیا ہے جو اس سلسلے کا طغرۂ امتیاز ہے یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاداتِ گرامی اور آپ کے اعمالِ حسنہ کو اس طریق سے بیان کرنا کہ پڑھنے والا یہ محسوس کرے کہ وہ انہیں خود اپنے کانوں سے سُن اور آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ مولانا نے احادیث کی تشریح کرتے ہوئے فنی پیچیدگیوں سے بھی دامن بچانے کی پوری کوشش کی ہے اور اس کا مطالعہ کرنے والوں کو اپنے فکر و عمل میں حضور سرورِ کائنات کی پیروی کی تلقین کی ہے۔ یہ سلسلہ بڑا قابلِ قدر ہے اور مسلمانوں کو اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیئے کتاب کا معیارِ طباعت و کتابت بہت عمدہ ہے۔

تاریخ طبری حصہ ششم | تالیف: علامہ ابو جعفر محمد بن جریر الطبری۔ ترجمہ: جناب سید محمد ابراہیم صاحب ایم۔اے شائع کردہ: نفیس اکیڈیمی۔ کراچی۔ قیمت مجلد سولہ روپے۔ صفحات: ۵۲۸

اس کتاب کی پہلی دو جلدوں کا ترجمان القرآن میں تعارف شائع ہو چکا ہے۔ زیرِ تبصرہ تصنیف اس کی چھٹی جلد ہے۔ اس میں عہد بنو امیہ کے آخری پچیس برسوں کے حالات قلمبند کیے گئے ہیں۔ اس میں اسلامی سلطنت کی وسعت پذیری اور کمالِ عروج کے بعد انحطاط کی علامات بھی سامنے آتی ہیں۔ یہ حصہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جنہیں بجا طور پر عمرِ ثانی کہا جاتا ہے، کے حالاتِ زندگی اور ان کے کارناموں سے شروع ہو کر مروان بن محمد یعنی سلسلہ مروانیہ کے آخری فرمانروا کے حالات پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس حصے میں دلفگار حالات کا تذکرہ موجود ہے جنہوں نے امت کی وحدت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔ دینِ حق جن مصیبتوں کو مٹانے کے لیے آیا تھا انہوں نے کس طرح سر اٹھانا شروع کیا۔ تاریخ سے کسی قوم کا ذہنی پس منظر ملتا ہے۔ اُسے نگاہ میں رکھے اور اس سے سبق لیے بغیر مستقبل کے لیے کوئی اچھی تعمیر نہیں کی جا سکتی۔ اس کتاب کو اُردو میں منتقل کرنے سے اسلامی تاریخ کے طلبہ کو کافی آسانی ہو گئی ہے۔ مگر اس سے استفادہ کرتے وقت انہیں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ اس میں جتنے واقعات درج کیے گئے ہیں وہ سارے استناد کے اعتبار سے ایک ہی پایہ کے نہیں۔ فاضل مصنف نے واقعات کو جمع کرنے میں بڑی عرق ریزی سے کام لیا ہے مگر انہوں نے جرح و تعدیل سے کام لے کر صحت کے اعتبار سے اُن کے مرتبہ اور مقام کو متعین نہیں کیا۔

(بقیہ اشارات)

اسے اپنے عشرت کدے کی زینت کا سامان سمجھتا ہے اور اُسے محض اپنی جنسی بھوک مٹانے کا ذریعہ خیال کرتا ہے اور پھر مزید ظلم یہ ڈھاتا ہے کہ اس معاملے میں اپنے آپ پر کوئی ذمہ داری اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ یورپ میں عورت کا جو حشر ہو رہا ہے اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہم یہاں مشہور مغربی خاتون اینی لبینٹ کے احساسات پیش کرتے ہیں:

"مغرب میں اگرچہ یک زوجگی کے چرچے ہیں لیکن وہاں درحقیقت تعدّدِ ازواج کی گرم بازاری ہے۔ ایک ایسی رسم جس میں مرد پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ جب مرد کا دل ایک عورت سے سیر ہو چکا ہے تو وہ اُسے دھتکار دیتا ہے اور وہ بیچاری بازاری عورت بن جاتی ہے۔ مرد اس سلسلے میں کسی ضابطے کا پابند نہیں۔ اس مظلوم عورت کی حالت اُن گھرانوں سے ہزار گنا بدتر ہوتی ہے جہاں مرد کے عقدِ نکاح میں ایک سے زیادہ بیویاں ہوں۔ تعدّدِ ازواج کی صورت میں کم سے کم مرد اُنکی محافظت اور کفالت تو کرتا ہے۔ جب ہم مغربی شہروں میں ہزاروں بے سہارا عورتوں کو رات کے وقت بے یار و مددگار سرگرداں دیکھتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ مغرب کو اس بات کا کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ تعدّدِ ازدواج کی وجہ سے اسلام کے خلاف زبانِ طعن کھولے۔ کیا عورت کے لیے یہ بات بدرجہا بہتر اور باعثِ آرام اور سکون نہیں کہ وہ سوکنوں کے ساتھ مل کر ایک مرد سے وابستہ رہے۔ اس کی آغوش میں جائز اولاد ہو اور معاشرے میں وہ عزت کی نگاہ سے دیکھی جائے، اور اس طرح اُس ظلم سے بچے جس کے تحت وہ فریب کا شکار ہوتی، گلیوں اور بازاروں میں ماری ماری پھرتی، اور ناجائز اولاد کو جنم دیتی اور بے سہارا اور بے بس ہو کر زندگی بسر کرتی ہے۔ جس کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا اور ہر وقت کسی مرد کی ہوس کی بھینٹ چڑھتی رہتی ہے۔ ماں کا مقدس مقام حاصل کرنے کی اس میں سرے سے صلاحیت ہی ناپید ہو جاتی ہے اور ہر جگہ اس کے خلاف نفرت اور بیزاری کا اظہار کیا جاتا ہے۔"
